

ابن سعود

# Ibn Saud

فیض محمد

# فہرست مضامین

## عرض حال

۶-۱	پہلا باب - تہید
۲۰-۷	دوسرا باب - ابتدائی حالات
۲۳-۲۱	تیسرا باب - ریاض کی فتح
۵۷-۲۴	چوتھا باب - رشیدیوں کی شکست
۶۸-۵۸	پانچواں باب - رشید کا انجام
۹۱-۶۹	چھٹا باب - سعودی فتوحات اور لاخوان کی تشکیل
۱۰۸-۹۲	ساتواں باب - نشیب و فراز
۱۱۶-۱۰۹	آٹھواں باب - انگریزوں سے دوستی اور سلطنت کی تنظیم
۱۳۳-۱۱۷	نواں باب - درمیانی زمانہ
۱۳۳-۱۳۵	دسواں باب - حسین کی شکست
۱۵۲-۱۴۲	گیارہواں باب - حائل کی فتح اور سلطان نجد
۱۷۷-۱۵۳	بارہواں باب - مکہ کی فتح
۱۸۸-۱۷۸	تیرہواں باب - حجاز کی فتح
۱۹۶-۱۸۹	چودھواں باب - اسلامی کانگریس اور مصری محل
۲۰۶-۱۹۷	پندرہواں باب - اصلاح حجاز
۲۲۴-۲۰۷	سولہواں باب - بغاوتیں
۲۳۱-۲۲۵	سترہواں باب - موجودہ طرز حکومت
	اشاریہ



ابن سعود



7A7A  
۶۸۵۰  
No. ۷۸۵۰  
وضع حال

عہد حاضر جس طرح سائنسی دور کہلایا جاسکتا ہے، اسی طرح اسے ہم دور قائدین بھی کہہ سکتے ہیں۔ دنیا کے کم و بیش ہر خطے میں قائدین کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور قائدین پیدا بھی ہو رہے ہیں۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال، ایران میں رضا شاہ، جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں موسولینی اور روس میں اسٹالین ہر قائد ایک مہتمم بالشان انسان دوستانہ مقصد لے کر پیدا ہوتا ہے اور اسے پایہ تکمیل کو پہنچانا اس کی زندگی کا نصب العین ہوتا ہے۔ حالات ظاہر کرتے ہیں کہ عرب کی سرزمین کو بھی ایک مصطفیٰ کمال یا ایک رضا شاہ کی ضرورت تھی اور اس نے ابن سعود کو پیدا کر لیا۔ اس زمانہ میں بیرونی اثرات کے تحت عرب سے اسلامی رنگ اڑتا جا رہا تھا اور اسلامی قوانین محض کتابی اصول کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ لیکن سلطان ابن سعود نے ایک روشنی گھر کی طرح بغاوتوں اور مخالفتوں کے طوفان خیز سمندر میں کھڑے ہو کر عرب میں اسلامیت کے احیاء کا بیڑہ اٹھایا، اور اپنے مقصد کی بنیادیں اس بنجیدگی اور



فراست سے ڈالیں کہ کرل لارنس جیسی عظیم الشان شخصیت کی دوزخ  
نگاہ بھی ان کی حقیقی عظمت کو پہچانتے میں دھوکہ کھا گئی۔

—۲—

اس سال گرما کی چھٹیوں میں میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ دنیا کے  
ان قائدین کے متعلق کچھ معلومات حاصل کروں اور اگر موقع ملے تو  
ان پر کچھ لکھوں۔ اس دلچسپ مشغلہ کی ابتداء میں نے مصطفیٰ اکمال اور  
ابن سعود کی سوانح عمریوں سے کی، اتفاق سے مجھے ان باکمال اور  
لگاتار روزگار ہستیوں پر بہت اچھا مواد دستیاب ہو گیا جن میں ایچ  
سی۔ آر مسٹر انگ کی بلند پایہ تصانیف ”گرے فوولف“ اور ”لارڈ  
آف ارے بیاہ“ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ دونوں مکمل سوانح  
عمریال ہیں اور بہت ہی تحقیق اور عرق ریزی سے لکھی گئی ہیں مصنف نے  
ان میں افسانوی اسلوب بیان اختیار کر کے انہیں اور دلچسپ بنا دیا  
ہے۔ مجھے بھی یہ اسلوب بہت پسند آیا اور میں نے اس تالیف کو  
اسی طرز پر ڈھلنے کی کوشش کی ہے۔

یہ کتاب جس وقت زیر تالیف تھی تو بعض احباب نے مجھ سے  
سوال کیا کہ ”ابن سعود میں ایسی کیا خصوصیت ہے جو آپ نے سب  
سے پہلے اس پر قلم اٹھایا؟“ اس میں کیا خصوصیت ہے؟ اس کا جواب  
آپ کو ان چند صفحات کے مطالعہ سے مل جائے گا۔ اس کے علاوہ  
ابن سعود پر ایک مستقل کتاب لکھنے کی ضرورت میں نے اس لئے بھی

محسوس کی کہ ایک تو یہ مسلمانوں کے ایک اولوالعزم بادشاہ ہیں اور اس مقدس سرزمین پر حکمران ہیں جس کے ساتھ دنیا کے تمام مسلمانوں کی حقیقی دلچسپی وابستہ ہے۔ نیز سلطان کے درخشاں کارنامے۔ ان کی خدا پرستی، ان کا صبر و استقلال، ذاتی وجاہت، انہماک کا راضی و خلوص، بہادری، اعلیٰ سیاست۔ شخصیت کے وہ گراں قدر اور انمول نیگینے ہیں جن کی ستائش ضروری ہے۔ ان سب سے زیادہ اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لئے جس چیز نے مجبور کیا وہ یہ ہے کہ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں سلطان کے حالات مستقل تصانیف کی صورت میں ملتے ہیں۔ لیکن اردو زبان میں اس طرح کا کوئی مواد موجود نہیں۔

— ۳ —

ابن سعود کے متعلق اکثر مسلمان مختلف شبہات رکھتے ہیں، اور کبھی میں بھی اسی طرح کے شبہات میں مبتلا تھا۔ لیکن جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق رہا ہے، ابن سعود کے متعلق یہ بات کہ وہ حدود شرعی اور سختی کے ساتھ صوم و صلوة کے پابند مسلمان ہیں کوئی بات ایسی نہ مل سکی جس سے ان کے حقیقی اسلام سے انحراف کا پتہ چل سکے۔ تاہم میں نے اکثر و بیشتر سنجیدہ احباب (جن میں اکثر حاجی ہیں) اور مخصوص عرب دوستوں سے اس سلسلہ میں گفتگو کی اور مبصہوں نے بالاتفاق ابن سعود کے متعلق اچھے خیالات کا اظہار کیا اور یہ بتلایا کہ سلطان ابن سعود

مخالفت صرف وہی لوگ ہیں جو خود ان کی حقیقی عظمت، ان کی حقیقی  
زندگی اور ان کے جذبہ ایمان سے واقف نہیں، بلکہ یہ ان لوگوں کا  
بیان ہر حق کی حالت

چول نہ دیدند حقیقت روافضانہ زوند

کے مصداق ہے۔

میرے سامنے واقعی یہ بڑا مشکل مسئلہ تھا کہ سلطان ابن سعود کے  
متعلق رائے قائم کرنے کے لئے میں اور کیا طریقہ کار اختیار کروں۔  
سوائے اس کے کہ مستند سونخ عمیہوں، سنجیدہ حجاج اور عرب کے صاحب  
الرائے باسٹندوں کے بیانات پر اعتبار کروں اور کوئی دوسری  
صورس ممکن نہ تھی۔ اور میں نے کیا بھی یہی۔

چاہئے کچھ کہیے، اتنا ضرور ہے کہ ابن سعود کی زندگی، زندگی کے  
نشیب و فراز، بہادری کے کارناموں اور اسلامی انصاف اور  
عدل گستری کا ایک دلکش مرقع ہے۔ ایک شخص عرب کی سرزمین  
میں ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوتا ہے جس میں کبھی بادشاہت  
ہاتھ باندھے کھڑی تھی اور جواب مرور زمانہ سے افلاس اور تنگدستی  
کا نمونہ بن گیا تھا۔ نہ کھانے کو کھانا اور نہ رہنے کو ٹھکانا۔  
اس کی ابتدائی زندگی عرب کے ریگستانوں میں وحشی بدویوں کے  
ساتھ گزرتی ہے، چند روز کے لئے وہ ایک بندرگاہ پر آتا ہے،  
وہاں اس کے خیالات پلٹا کھاتے ہیں، کھوئی ہوئی سلطنت کو حاصل

کہنے اور عرب کو آزاد کرانے کا خیال اس کے دل میں موجزن ہوتا ہے  
 چند آدمیوں کے ساتھ وہ نجد کے دارا خلا فدیاض پر قبضہ جانے کے لئے  
 روانہ ہوتا ہے۔ لوگ اس پر ہنستے اور اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں، لیکن  
 وہ ان کی کچھ پرواہ نہیں کرتا، اللہ کا نام لے کر اور اس پر کامل بھروسہ  
 کر کے حقیر ساز و سامان کے ساتھ، اپنے چند من چلے ہم خیالوں کے  
 ہمراہ ریاض پہنچتا اور صرف چھ آدمیوں سے اس بڑے شہر پر قبضہ کرتا  
 ہے۔ اس کے بعد اس کے ہاتھوں اس کے خاندانی دشمن رشیدیوں  
 کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چند سال کے اندر اندر وہ عرب کے وسطی  
 حصہ یعنی نجد کا سلطان بن جاتا ہے، پھر اپنے ملک کو غیر ملکی جوئے  
 سے آزاد کرتا ہے اور حجاز کی طرف بڑھ کر، حنین جیسے ہا اثر شخص  
 کو نکال باہر کر کے ارض مقدس سے بدعنوانیوں اور ریا کاریوں کا  
 استیصال کرتا ہے۔ جاہل و حشی بدویوں کو تعلیم و تربیت کے ذریعہ  
 انسان بناتا ہے، سارے ملک میں امن پیدا کرتا ہے، عوام  
 سے قرآن و حدیث کی سمجھتی سے پابندی کراتا ہے۔ غرض ایک  
 ایسے ملک کو جو صدیوں سے گوشہ گنہامی میں خاموش پڑا سو رہا  
 تھا، جگا کر تمدن ممالک کی صف میں لاکر کھڑا کرتا ہے۔

اگر حالات یہ ہیں تو کیا ایسے شخص کو بے دین، ایمان فروش  
 اور نااہل کہنا انصاف کا خون نہیں ہے؟

آخر میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہر بڑے کام میں انسان سے

نغزشین ہو جایا کرتی ہیں۔ اگر آپ اپنے گھر میں ایک چھوٹی سی تقریب کریں تو عدد درجہ انتظام و اہتمام کے باوجود پھر بھی بعض فروگذاشتیں ہو جائیں، اس طرح اس عظیم الشان مہم میں ممکن ہے کہ سلطان ابن سعود یا ان کے ساتھیوں سے کہیں کوئی نغزش ہو گئی ہو تو کیا ان جزئیات پر خود بینی تنقید کر کے سارے کارناموں پر پانی پھیر دینا قرین مصلحت کہلایا جاسکتا ہے؟

— ۴ —

اس کتاب کی تالیف میں مجھے اپنے دوست مولوی عمر یافعی صاحب اور مصوری کے لئے مولوی عزیز الدین صاحب (عثمانیہ) سے کافی مدد ملی میں ہر دو اصحاب کا مشکور ہوں۔ آخر میں میں توقع کرتا ہوں کہ ناظرین اس کتاب کو غیر جانبدارانہ کوشش تصور کر کے مطالعہ فرمائیں گے۔

فیض محمد

المرقوم ۲۵ ستمبر ۱۳۲۵ھ  
م ۲۸ جنوری ۱۹۳۶ء

# پہلا باب

## تمہید

عرب ایک ریگستانی ملک ہے۔ نہ وہاں کافی بارش ہوتی ہے اور نہ دریا ہیں، نہ جنگل ہے نہ مرغزار۔ جس طرف نظر اٹھاؤ سوائے ریگستان اور ریتیلے ٹیلوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میلوں تک نہ کوئی درخت نظر آتا ہے اور نہ ہی پانی پینے کے لیے کوئی چشمہ ملتا ہے۔

کئی صدیوں تک عرب کے سرحدی ممالک تمدن کے معراج پر پہنچے اور پھر انہیں زوال ہوا۔ بے شمار سلطنتیں بنیں اور بگڑ گئیں مشرق میں دجلہ اور فرات کے کناروں پر بابل اور نینوا کی شاندار حکومتیں، ایران کی ہخامنشیان ترقی مغرب میں فرعون مصر کی عظیم الممال اور خدایہ حکومت، ان کا جلال اور شان و شوکت شمال میں فونیقیہ

اور رومی سلطنت کا عروج اور پھر ان سب کا زوال ہمارے بیان کا ثبوت ہے۔ غرض عرب کے اطراف و اکناف میں تمدن نے سینکڑوں کروٹیں لیں لیکن خود عرب اس سے بھی متاثر نہ ہوا اور وہ جیسا تھا ویسا ہی رہا۔ بیرونی حاکم کے لوگ اس کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ البتہ تاجروں کی زبانی عرب اور بالخصوص وسط عرب کے کچھ حالات معلوم ہو جاتے تھے لیکن ان کے بیانات بھی دلچسپ افسانوں سے کچھ کم نہ تھے۔ یوں تو تاجر کہا کرتے تھے کہ عرب میں بہت سی تمدن اقوام آباد ہیں، بڑے بڑے شہر ہیں اور بہت سی عجیب غریب چیزیں ہیں۔ لیکن ان کے بیان کی تصدیق کا کوئی وسیلہ نہ تھا البتہ حقیقت اس وقت آشکار ہوئی جب حضرت مسیح کی پیدائش سے قبل شاہ آگسٹس نے اپنے مصری گورنر کو سرزمین عرب کی چھان بین کے لیے روانہ کیا۔ اس نے تحقیقات کے بعد بتلایا کہ عرب ایک ریگستانی ملک ہے اور یہاں وحشی قبائل آباد ہیں نہ کھانے کو کھانا ہے اور نہ پینے کو پانی۔ چنانچہ مصری گورنر کے اکثر ساتھی بھوک پیاس کی تاب نہ لا کر راستہ ہی میں ختم ہو گئے۔

عرب میں سوائے 'بہالت و مظالم کے اور کچھ نہ تھا' اس کے باشندے ایسے ہی وحشی تھے جیسی کہ یہ سرزمین افتادہ اور خنجر ہے۔ چند چشموں اور نخلستانوں پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا اور اسی کے لیے وہ خون کی ندیاں بہاتے تھے۔ بت پرستی، افلاس، ریاکاری اور بد معاشی کا بازار گرم تھا، ہر قبیلہ اور ہر شخص آزادی کا طالب اور خود مختارانہ زندگی

بسر کرنے کا دعویدار تھا۔ ان منتشر اور سر بھرے قبائل کو رام کرنا ان کو ایک ڈوری میں منسلک کر کے ان پر حکومت کرنی، ماحول کے لحاظ سے کسی کے بس کی بات تھی۔ اور اسی لیے صدیوں سے یہ اسی حالت میں غلطاں و بیچاں رہے۔

ایسے فاذک وقت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ربانی مشعلِ ہدایت لے کر عرب کی سرزمین پر تشریف لائے۔ آپ نے چند سال کے اندر اندر عربوں کے منتشر قبائل میں اتحاد پیدا کیا، ان کو گناہوں سے روکا اور سب کو ایک کر دیا۔ دس سال کے اندر سارا ملک عرب آپ کے ساتھ ہو گیا۔ آپ کی تعلیمی تجلیات نے نہ صرف ظلمت کدہ عرب کو بقیعہ نور بنا دیا بلکہ ان کی ضیاء باری کا اثر ساری دنیا پر پھیل گیا۔ آپ کے تابعین اور تبع تابعین دریائے فرات سے گزر کر ایران تک پہنچے اور پطرس بھی آگے بڑھ گئے۔ شمال میں شام سے ہو کر ایشیائے کوچک تک جا پہنچے، مغرب میں افریقی ساحل سے ہوتے ہوئے بحیرہ اوقیانوس اور پھر اسپین، فرانس اور یورپ کے وسط میں پہنچ گئے۔ اور ایک سو سال کے اندر مسلمانوں کی حکومت آبنائے جبل الطارق سے لے کر دریائے سندھ تک اور اوسط افریقہ سے لے کر ایران تک پھیل گئی۔

لیکن جیسی جیسی اسلامی حکومت ترقی کرتی گئی، عرب اس کا مرکز نہیں رہا بلکہ یکے بعد دیگرے دمشق، بغداد اور قاہرہ اسلامی تمدن کے گہوارے بننے لگے۔ اگرچہ یہ چراغ عرب میں روشن ہوا اور اس نے سارے عالم میں اُجالا



پھیلا دیا لیکن ایک صدی کے اندر ہی وہ خود پھرتاریکی میں آ گیا۔ اس کے بعد سے دنیا نے کئی پٹے کھائے لیکن عرب ان سب سے الگ تھلک اور بے تعلق رہا اور پھر سے ایک مرتبہ اس پر غفلت کا نشہ ماری ہو گیا۔ اکیہزرا سال تک اس کی یہی حالت رہی۔

لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی میں ایک شخص محمد بن عبدالوہاب پیدا ہوا اور پھر سے اس نے اسلام کے اس کبھرے ہوئے شیرازہ کو ایک جگہ کرنے کی کوشش کی۔

ابن عبدالوہاب ایک سخت مذہبی جوش والا انسان تھا۔ اسلام میں اعتقادات و تکلفات کی جو فراوانی ہو گئی تھی اُسے دور کر کے وہ سلام کو اسی سادہ لباس میں دنیا کے آگے پیش کرنا چاہتا تھا جس طرح سرکارِ دو عالم نے تعلیم فرمائی تھی۔ اہل عرب کو اس نے اس طرف متوجہ کیا، وہ اس پر بُری طرح بگڑے اور اس کے سخت دشمن ہو گئے۔ ابن عبدالوہاب نے بھاگ کر دار الخلافہ نجد میں پناہ لی۔ یہاں محمد ابن سعود کی حکومت تھی۔ نجد، عرب کا وسطی علاقہ ہے۔ یہاں کے باشندے بڑے معنسی اور جفاکش ہیں۔ اس کی تین طرف ریگستان ہے اور ایک طرف وادیاں۔ یہ ایک سطح مرتفع پر واقع ہے۔ اس میں کئی گاؤں اور نخلستان ہیں۔ یہاں سطح مرتفع کے وسط میں ایک زرخیز وادی ہے۔ اس میں کافی پانی ہے اور کئی نخلستان اور بڑے بڑے باغ ہیں۔ اس وادی میں شہر ”ریاض“ واقع ہے۔ ریاض نجد کا مرکز ہے اور نجد عرب کا

مرکز۔ اس طرح سے جس کی حکومت نجد پر ہوگی وہ عرب پر اچھی طرح حکمرانی کر سکتا ہے۔

سعود، دار یہ اور ریاض کا امیر تھا۔ یہ بڑا لالچی آدمی تھا، اس نے ابن عبدالوہاب کی حقیقی قیمت کو مائل لیا اور اس سے اس امر کا پیمانہ کیا کہ وہ اور یہ دونوں مل کر عرب کے باشندوں کو سچے اسلام کی تعلیم دینگے۔ انہیں کامیابی یقینی تھی۔ سعود ایک بڑا سپاہی اور تلوار کا مدنی تھا اور ابن عبدالوہاب زبردست عالم اور مبلغ۔ سعود لاتا اور یہ تبلیغ کرتا۔ عرب کے باشندوں پر اس کی تبلیغ کا گہرا اثر ہوا۔ روزہ اور نماز اور قرآن کریم کے دیگر احکامات کی سختی کے ساتھ پابندی کی جانے لگی۔ شراب اور تمباکو کی سخت ممانعت کر دی گئی۔ یکے بعد دیگرے قبائل نے اس کی حکومت تسلیم کی۔ ان کے دشمنوں نے انہیں وہابی کہہ کر پکارنا شروع کیا۔ لیکن ان کی کچھ پیش نہ گئی اور ساٹھ سال کے اندر تمام عرب پر یعنی خلیج فارس سے لیکر مکہ اور مدینہ تک اور پھر بحر ہند سے لیکر شام کے کوہ لبنان تک ان کی حکومت کا جھنڈا لہرانے لگا۔ اب وہ ریگستان کے بادشاہ تھے۔ خلیفہ اور ترکوں کو مانتے نہ تھے۔ انہیں کسی کی پرواہ نہ تھی، وہ بلا خوف و خطر چاروں طرف چھاپے مار رہے تھے۔ میسوپوٹومیا پر حملہ کر کے انہوں نے کربلائے معلیٰ کو مسمار کر دیا علی پو پر حملہ کر کے اسے باجگزار بنالیا اور دمشق کی سرحد پر اور بصرہ میں بھی ایک ہنگامہ مچا دیا۔ ترکوں نے خطرہ کو پہچان کر اپنے مصری گورنر

محمد علی کو دہائیوں کی تنبیہ کے لیے رواء کیا۔ اس نے انہیں شکست دی اور دہائی سردار کو پا بہ زنجیر کر کے قسطنطنیہ روانہ کر دیا جہاں ابا صوفیہ کی مسجد کے آگے ایک عظیم الشان مجمع کے سامنے اس کی گردن اڑا دی گئی۔

دہائیوں کی حکومت گویا ہوا کا ایک جھونکا تھی، جو آن واد میں آیا اور چل دیا۔ اب نجد پھر اپنی اصلی حالت پر آ گیا۔ کوئی حوصلہ مند ایسا نہ تھا جو اسے مستدرکھتا، قبائل میں پھر سے انتشار پیدا ہو گیا۔ یہ لوگ انفرادی آزادی اور خود مختاری کے طالب ہو گئے، باہمی نزاعات برپا ہوئیں، لوٹ مار اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا، عرب گویا قتل و خون اور فساد کا مرکز بن گیا۔ کسی کی جان امن میں نہ تھی۔ ہر شخص غیر مطمئن اور اپنے حریف کی جان لینے کے لیے تیار تھا۔

نومبر ۱۸۱۸ء کے اسی پر آشوب اور ناگفتہ بہ زمانہ میں سعودی خانہ کے ایک رکن عبدالرحمن کی بیوی سارا کے بطن سے ریاض کے محل میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام عبد الغریز رکھا گیا جو بعد میں چل کر اپنے اجداد کے نام سے

ابن سعود

مشہور ہو گیا۔

# دوسرا باب

## ابتدائی حالات

————— ( ۱ ) —————

وہ بچے خوش قسمت ہیں جن کی پرورش اور تعلیم و تربیت میں سنجیدہ ماں باپ نے حصہ لیا ہو، کیونکہ جس تن دہی اور خلوص کے ساتھ ماں باپ توجہ دے سکتے ہیں کوئی دوسرا یہ کام اس خوبی سے نہیں کر سکتا۔ ایسے بچے آگے چلکر اپنے ماں باپ کا نمونہ بنتے ہیں۔

ابن سعود کی پرورش بھی محل کے اندر ماں کی گود میں اور ماں کے دودھ پر ہوئی۔ اس کی ماں سارا، قبیلہ ”دواسر“ کے سردار احمد سویری کی لڑکی تھی، یہ بڑی تنومند اور مضبوط عورت تھی۔ تمام عرب عورتوں کی طرح سات سال کی عمر سے پردہ کرتی اور محل کے اندر ہی رہا کرتی تھی اور جب کبھی باہر نکلتی تو کوئی حبشی غلام اس کے ہمراہ ہوتا۔

اور عرب عورتوں کی طرح وہ بھی پڑھنے لکھنے سے بالکل بے بہرہ تھی۔ البتہ قدرت نے اس میں قوت فیصلہ اور عقل سلیم کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ گھر کا کام کاج اسی کے مشوروں پر چلتا تھا، خاندان کے افراد پر اس کا بہت اچھا اثر تھا اور سب اسے صائب رائے مانتے تھے۔

دو دو چھڑائی تک ابن سعود کی پرورش بالکلیہ ماں کی گود میں ہوئی۔ اس کے بعد اسے ایک حبشی غلام کی نگرانی میں دیدیا گیا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا اور اس کی حفاظت کیا کرتا تھا۔ ابن سعود اکثر محل کے اندر اپنی ماں اور بہن سے ملنے جایا کرتا تھا۔ ماں اسے بہت پیار کرتی تھی اور اس کی بڑی بہن نوری اسے بہت عزیز رکھتی تھی۔ وہ گھنٹیل اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا، زیادہ تر مردانہ ہی میں رہنے لگا اور عورتوں سے ملنا جلنا نسبتاً کم کر دیا۔ ابن سعود کے ساتھ اکثر اس کے ہم عمر حبشی غلام رہا کرتے تھے اور اس کی طغیل میں ان کی بھی پرورش ہو جایا کرتی تھی۔ بچپن کے یہی ساتھی آگے چلکر اس کے محافظ دستہ کے قابل اعتماد اور جاں نثار سپاہی بن گئے۔

جب ابن سعود چلنے لگا تو اس کے والد عبدالرحمن نے اس کی تربیت اپنے خدمتہ کرلی۔ عبدالرحمن ولایتوں کا امام اور سخت مذہبی آدمی تھا۔ ولایتی خود بڑی سخت طبیعت کے لوگ تھے، عیش آرام سے کنارہ کش تھے، آرائش اور زیبائش سے سخت متنفر تھے، ان کی مساجد، مینار، قبوں اور نقش و نگار سے مزین نہیں ہوتی تھیں، تعیشات مثلاً شراب، مکلف غذا

متبا کو ریشمی کپڑوں وغیرہ سے اجتناب کرتے اور گانے بجانے اور ہر قسم کی موسیقی کے وہ سخت مخالف تھے۔ حتیٰ کہ ہنسی پر بھی وہ غضبناک ہو جاتے تھے۔ ان کا مسلک دنیوی عیش و نشاط سے دور رہ کر وحدہ لا شریک لہ پر اپنی توجہ مرکوز کرنا اور قرآن اور حدیث پر سختی کے ساتھ عمل کرتا تھا۔ اگر ان کی نفی و کجی اور بے گئی کا کوئی سامان تھا تو وہ صرف ان کے بال بچے تھے۔ اس کے علاوہ دنیوی آرام و آسائش کو انہوں نے بڑی حد تک اپنے پر حرام کر لیا تھا۔ عبدالرحمن نہ صرف ان میں سے ایک تھا بلکہ ان کا امام اور وہابی نقطہ نظر کی شدت کے ساتھ پابندی کرتا تھا۔ اپنی اولاد کو اس نے وہابیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی۔ ابتدا میں ابن سعود کو رہین کے مدرسہ میں تعلیم کی غرض سے روانہ کیا گیا۔ پہلے تو وہ بہت ہی لا پروا اور کھلنڈ راہنابت ہوا لیکن باپ کی تربیت اور نگرانی نے اس کے میلان سب کو بدل دیا چنانچہ سات سال کی عمر میں وہ پابندی سے پانچ وقت کی نماز جامع مسجد میں ادا کرتا اور روزہ رکھتا اور اس کم عمری میں وہ قرآن مجید کی اکثر آیتیں نہایت صحت کے ساتھ زبانی تلاوت کیا کرتا تھا۔

عبدالرحمن حد درجہ دمن کا پکا اور مستقل مزاج انسان تھا۔ اس کا نصب العین اپنے جد - سعود اعظم - کی کھوئی ہوئی سلطنت کو پھر سے حاصل کرنا تھا، اس کی بڑی خواہش یہ تھی کہ اور ایک مرتبہ تمام عرب قبائل کو ایک ہی زنجیر میں منسلک کر کے اتحاد اور رواداری پیدا

کرے اور ان سب کو دہانی بنائے۔ اسی طلوعِ نظر کے ساتھ وہ اپنے مقصد کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ اور اس کی دلی تمنا یہ تھی کہ اگر وہ خود اس کام کو پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے تو کم از کم اس کی اولاد اس کو ضرور پورا کرے۔ چنانچہ اپنی اولاد کی تعلیم میں اس نے ہمیشہ اسی چیز کو پیشِ نظر رکھا۔ یہ کام بڑا دق تھا۔ اس کیلئے جنگ و جدل کی تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی ضرورت تھی۔ اسی مقصد کے لیے ابنِ سعود کو اس نے تیار کیا۔ تلوار کا فن بتایا، گولی چلانی اور گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سواری کرنی سکھائی اور اُسے دشوار گزار راستوں طویل مسافروں پر روانہ کیا کہ وہ تکالیف کو برداشت کرنے کا عادی ہو جائے۔ ہر موسم میں اسے آفتابِ طلوع ہونے سے دو گھنٹے قبل جگا دیا جاتا تھا کہ اس میں استی اور کاہلی نہ پیدا ہونے پائے۔ گرما کے موسم میں مین دوپہر کے وقت ریتیلے میدانوں میں برہنہ پیر دوڑایا جاتا تھا کہ وہ سختی کا خوگر بن جائے۔ اس تربیت و نگہداشت نے اسے باپ سے بھی زیادہ توانا اور مضبوط بنا دیا۔

اس طرح ابنِ سعود کو فنِ سپاہ گری سے خاص لگاؤ پیدا ہو گیا۔ ”ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات“ اس نے ابتداء ہی سے وہ جو ہر کھلاؤ کہ دیکھنے والوں نے تارا لیا کہ یہ آگے چل کر کچھ ہو رہیگا۔

لیکن ابنِ سعود ریاض کی محدود زندگی کے علاوہ بیرونِ دنیا سے بہت کم واقف تھا۔ اہل ریاض بڑے غیور اور شرمی تھے۔ غیر ملاک کے باشندوں سے نہ خود ملتے اور نہ انہیں اپنے پاس بٹھکنے دیتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی تاجر

اپنا مال و اسباب اور غلام لے کر فر دخت کی خاطر ریاض آتے تو بیرونی ممالک کے رہنے والوں کی صورت نظر آ جاتی تھی۔

(۲۰)

ابن سعود کے لوگوں کا زمانہ بہت ہی خطرہ اور ہڑ بونگ کا زمانہ تھا۔ ریاض کی اطراف بدوی (وحشی) آباد تھے۔ شمال میں آل شام محمد ابن رشید کے ساتھ متحد ہو گئے تھے۔ محمد رشید ایک اہل گرو لاجپی حکمران تھا۔ اس نے حائل کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور ریاض اور نجد کے دیگر خوش حال علاقوں کو وہ اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش میں تھا۔ ایسی حالت میں اہل ریاض کس طرح چین سے بیٹھ سکتے تھے؟ انہیں ہمیشہ بیرونی حملوں کا خطرہ لگا ہوا تھا، چنانچہ ریاض کے دروازہ پر ہر وقت سپاہی پہرہ دیتے رہتے اور بغیر جھڑتی اور سخت پوچھ گچھ کے کسی کو اندر داخلہ کی اجازت نہ تھی روزانہ صبح اور دن میں تین مرتبہ جب لوگ نماز کے لیے مسجد جاتے تو شہر کے تمام دروازے بند کر دئے جاتے کہ اس اثناء میں دشمن اندر داخل نہ ہو سکیں۔

اس کے علاوہ محل کی حالت بھی قلعہ کی سی تھی کیونکہ بیرونی حملوں کے قطع نظر ریاض خانہ جنگیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ عبدالرحمن کے تین بھائی تھے۔ عبداللہ سعود اور محمد۔ یہ سب اقتدار کے لیے آپس میں ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے۔ دس سال تک عبدالرحمن کے بڑے بھائی عبداللہ اور سعود میں جھگڑا ہوتا رہا۔ بالآخر



عبداللہ نے سعود کو نکال باہر کر دیا۔ سعود مشرقی صوبہ احساء میں پناہ گویں ہو کر عجمانیوں سے مل گیا اور انہیں ساتھ لے کر ریاض پر دھاوا بولا اور عبداللہ کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔ لیکن اتفاق سے وہ اس دنیا سے بہت جلد کوچ کر گیا۔ اور پھر سے عبداللہ واپس آگیا۔ لیکن ابھی مخالفتوں کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ سعود کے لڑکے اب بھی اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے تھے۔ اس طرح سے ریاض میں اب دو بڑے گروہ بن گئے ایک تو سعود کے لڑکے اور ان کے ساتھی دوسرے عبداللہ اور ان کے شریک۔ یہ علانیہ بازاروں میں لڑتے اور قتل و خون کیا کرتے تھے۔ عبدالرحمن نے اپنے چوتھے بھائی محمد سے مل کر صلح کرنی چاہی مگر وہ اس پر راضی نہ ہوا بلکہ اٹے اسی پر ٹوٹ پڑا اور خود عبدالرحمن کی جان کے لالے پڑ گئے۔ اس اثناء میں سعود کے لڑکوں نے عجمانیوں کی حمایت سے حملہ کیا اور عبداللہ کو قید کر کے ریاض پر قبضہ کر لیا۔ ابھی سعود کے لڑکوں کے قدم جمنے نہ پائے تھے کہ اس گڑ بڑ میں رشید ریاض پر حملہ کیا، انہیں پسپا کر کے ریاض پر قبضہ کر لیا اور عبداللہ کو اپنے ساتھ لیجا کر حائل میں آل شامر کے شیخ سلیم کے پاس نظر بند کر دیا۔ اس لڑائی میں رشید کے ایک بھائی عبید نے محمد کو قتل کر دیا اس اثناء میں عبداللہ بیمار ہو گیا، رشید نے ایک ایرانی ڈاکٹر سے اس کا علاج کروایا۔ ڈاکٹر نے اس کی حالت کو خطرناک بتایا۔ رشید یہ نہیں چاہتا تھا کہ عبداللہ کے قاتل کی حیثیت سے اپنے دامن

دعوتہ بگائے۔ اس لیے اس نے ایک چال چلی، عبدالرحمن کو حامل  
 بلوایا اور کہا کہ وہ اپنے بھائی کو اپنے ساتھ ریاض لے جائے۔ لیکن  
 ابھی وہ ریاض پہنچا بھی نہ تھا کہ عبداللہ کا انتقال ہو گیا۔

(۳)

عبدالرحمن کے تینوں بھائیوں کا انتقال ہو چکا، وہ اب بالکل  
 تنہا تھا۔ ابتدا ہی سے وہ غیروں کا مخالف اور اپنے اجداد کی کھوئی  
 سلطنت کو واپس لینے کا دعویدار تھا۔ آل رشید کی مداخلت اور  
 حکومت اس پر بہت شاق گزر رہی تھی، اس نے انہیں بے دخل کر نیکا  
 مصمم ارادہ کر لیا۔ اس معاملہ میں پہلے اس نے اپنے بھتیجوں سے  
 مل کر کام کرنے کا ارادہ کیا لیکن ان لڑکوں نے اسے غدار کہہ کر  
 موافقت سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد وہ نجد کے ممتاز  
 اور سربراہ اور وہ لوگوں سے ملا، ان کے ذریعہ اہل ریاض کو اکسائے  
 کی کوشش کی، قبائل کے نام پر وائے بھیجے لیکن سب بے سود،  
 سمجھوں نے نفی میں جواب دیا۔ ان پر رشید اور شیخ سلیم کی دعا  
 بیٹھی ہوئی تھی کیونکہ اس سے پہلے بھی انہوں نے سر اٹھایا تھا کہ  
 آل رشید نے انہیں نیچا دکھایا۔ ان کا یلہ بھاری تھا۔

عبدالرحمن کو ناکامی پر ناکامی ہوتی گئی، اگر دوسرا کوئی آدمی ہوتا  
 تو اپنے ان ارادوں سے باز آتا مگر عبدالرحمن کمزور دل کا انسان نہ تھا،  
 وہ خطرہ کے منہ میں باغیوں اور جاسوسوں کے نرغہ میں استقلال اور

جو انہر دی سے کام کرتا اور ہر لحظہ اپنی کامیابی کے لیے نئے نئے منصوبے گھڑتا تھا۔ رشید کو اس کی اطلاع ہو گئی، اس نے سلیم سے کہا کہ وہ عبدالرحمن کو دیکھ لے تاکہ پھر کبھی وہ سر نہ اٹھا سکے۔ نہ صرف یہی بلکہ وہ سعودی خاندان کو دفعتاً نیست و نابود کر دینا چاہتا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ”افعی راکشتن و بھجہ اش را نگہداشتن کار خردمند نیست“۔ اس لیے اس نے یہ تجویز نکالی کہ عبدالرحمن سے ملاقات کا ایک وقت مقرر کر کے خاندان کے تمام اراکین کو ملاقات کے بہانے اسی مقام پر بلا کر سب پر ایک ساتھ حملہ کر دیا جائے۔ ملاقات کا وقت مقرر ہو گیا اور ساتھ ہی اس منصوبے کی اطلاع بھی عبدالرحمن کو ہو گئی، یہ بھی حملہ کی مدافعت کے لیے خفیہ طور پر تیار ہو گیا۔

سلیم مقررہ وقت پر پہنچا۔ عبدالرحمن نے محل کے درباری ایوان میں اس کا استقبال کیا۔ دونوں بڑے تپاک سے ملے۔ چارپئی اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ عبدالرحمن کی سیدھی جانب خاندان کے چند اراکین تھے، ان میں عبدالرحمن کا بچہ سعود بھی اپنے حبشی غلام کے ساتھ موجود تھا۔ سلیم نے خواہش کی کہ خاندان کے اراکین بھی ملاقات کے لیے بلوائے جائیں۔ اس پر عبدالرحمن نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ برہنہ تلواریں لیے بجلی کی طرح اندر ٹوٹ پڑے، لڑائی شروع ہو گئی۔ عبدالرحمن کے لوگوں نے سلیم کے ساتھیوں کی خوب خبر لی اور سلیم گرفتار کر لیا گیا۔

ابن سعود نے یہ اپنی عمر میں پہلی دفعہ قتل و خون کا نظارہ کیا !  
 یہ خبر آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی۔ دیہاتی اور ہمسایہ قبائل  
 رشید کے مظالم سے تنگ آچکے تھے، انہوں نے عبدالرحمن کا ساتھ دیا۔  
 ادھر رشید نے بھی بڑا زور مارا اور ہر دفعہ عبدالرحمن کو شکست دی۔ تمام  
 ملک میں بد امنی پھیل گئی، جنگ و جدل کا بازار گرم ہو گیا اور لوگ  
 فاتحے کرنے لگے۔ سُبھوں نے عبدالرحمن کو صلح کے لیے مجبور کیا، اس نے  
 پہلے انکار کیا لیکن بعد کو مانتے ہی بنی۔ مجبور ہو کر اس نے صلح کے لیے  
 آدمی بھیجے اور ضمانت میں اپنے لڑکے عبدالعزیز کو روانہ کیا اور سلیم کو  
 چھوڑ دیا۔ اب تمام ملک پر آل رشید قابض تھے۔ صلح کے بعد رشید  
 عبدالرحمن کو ریاض کا حائل بنا کر حائل چلا گیا۔ رشید کی واپسی کے  
 بعد قبائل پھر اس کے خلاف ہو کر عبدالرحمن سے مل گئے۔ عبدالرحمن  
 ان کو ساتھ لیکر رشید پر حملہ کرنے کے لیے حائل کی طرف روانہ ہوا۔  
 اس دفعہ عبدالرحمن کا دس سالہ لڑکا ابن سعود بھی، اپنے حبشی غلام  
 کے ساتھ باپ کے ہمراہ لڑائی کے لیے روانہ ہوا۔

(۴)

عبدالرحمن کی یہ کوشش محض ایک ولولہ تھا، اس میں تہی سکت  
 کہاں تھی جو رشید کا مقابلہ کر سکتا، شہر والے گذشتہ محاصرہ سے  
 تنگ آکر صلح کے لیے مصر تھے اور اکثر قبائل گو رشید کے مخالف تھے  
 تاہم ان کے دلوں میں رشید کا اس قدر ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ اس سے

مذہبیر کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی ان حالات کے تحت اگر عبدالرحمن  
پسپانہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ رشید نے عبدالرحمن کا بُری طرح پیچھا کیا  
اور قسم کھائی کہ اب کی دفعہ وہ ان زہریلے سانپوں کا قلعہ فتح  
کر کے راہیگا۔

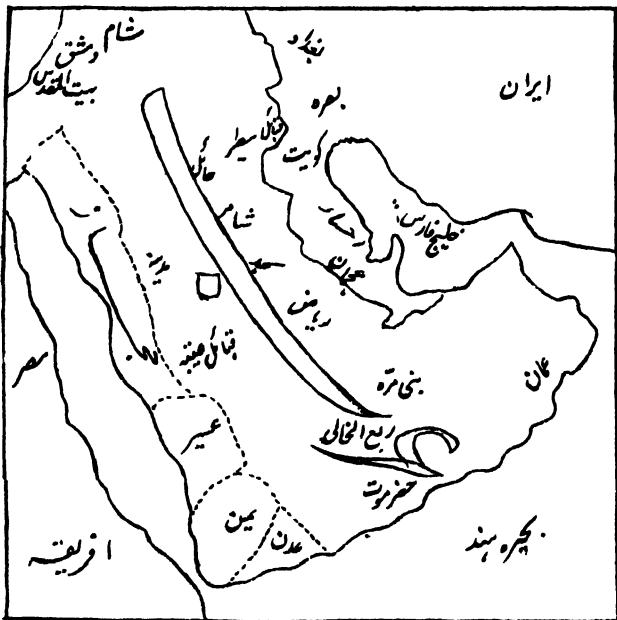
اب عبدالرحمن کے لیے بڑا نازک وقت آگیا۔ اس نے بھاگ کر  
قلعہ میں پناہ لی اور ایک رات اپنے خاندان کو لے کر صبح ہوئی  
پیشتر اونٹوں پر سوار ہو شہر کے مشرقی بھاٹک سے چپ چاپ روانہ  
ہو گیا اور احسا، پہنچ کر آل عجمان کے شیخ کے پاس پناہ لی۔ آل عجمان  
نے ریگستانی قانون کے مطابق اسے پناہ دی مگر عبدالرحمن آل عجمان  
کی غیر مستقل مزاجی اور ان کے متلون طبائع سے خوف واقف تھا وہ  
جانتا تھا کہ اگر آج نہیں تو کل یہ ضرور ایک دم مخالف ہو جائیں گے۔  
ان دنوں ابن سعود گٹھیاٹی بخار میں مبتلا تھا، عبدالرحمن نے  
اسے اپنے ساتھ رکھ لیا اور خاندان کے دوسرے افراد کو  
”جزیرہ بحرین“ روانہ کر دیا۔ اس طرح خاندان کی طرف سے مطمئن ہو کر  
اس نے اطراف کے قبائل سے گفت و شنید شروع کی لیکن  
بسموں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ پھر اس نے چند بدیو  
کو اُبحار کر ریاض پر حملہ کیا لیکن نجدیوں کی امداد نہ دینے کی وجہ سے  
اسے بُری طرح پسپا ہونا پڑا۔  
جب وہ واپس لوٹا تو احسا کے ترکی عامل نے اسے یاد کیا۔

عرب میں ترکوں کی حکومت برائے نام تھی۔ انہیں صرف چند خوش حال مقبوضہ مثلاً مین، عسیر، حجاز وغیرہ پر تسلط حاصل تھا۔ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے ترکوں نے ایک مخصوص پالیسی اختیار کر رکھی تھی وہ یہ کہ مختلف قبائل کو آپس میں لڑا دینا اور کسی قبیلہ یا اس کے سردار کو ابھرنے نہ دینا۔ اس طرح انہوں نے عرب کی منتشر قوتوں میں ایک طرح کا توازن قائم کر رکھا تھا۔ لیکن اب چونکہ سعودیوں کو کافی شکست ہو چکی تھی اور آل رشید زور پکڑ رہے تھے اس لیے انہوں نے سعودیوں کی طرف داری شروع کی اور عبدالرحمن کو امداد دینے کا وعدہ کیا لیکن عبدالرحمن نے صاف طعہ پر ان کی امداد کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک سچا عرب تھا، ترکوں کی امداد قبول کرنا اس کی شان اور فطری غیرت کے خلاف تھا۔ اس کے علاوہ وہ عرب میں ترکوں کے بجا دخل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ اس طرح عبدالرحمن کے کسی دشمن ہو گئے۔ آل رشید، آل عجمان، سعود کے لڑکے اور ترک۔ احسا میں اس کی خیر نہ تھی اس لیے ابن سعود کو ساتھ لے کر اس نے ”ربع الخالی“ کا رخ کیا۔ یہ ایک وسیع ریگستان اور بنجر علاقہ ہے، یہاں بنی مرہ آباد تھے وہ ان کی پناہ میں آ گیا۔

(۵)

مرہ قبائل بڑے وحشی تھے، یہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے، کھجور اور اونٹوں کا دودھ ان کی غذا تھی۔ کبھی کبھی گوشت بھی کھا لیا کرتے تھے۔ ان کے کوئی گاؤں نہ تھے۔ غذا کی تلاش میں

وہ ہمیشہ خانہ بدوش رہتے تھے۔ لوٹ مار ان کا خاص مشغلہ تھا۔ ان کی لوٹ مار کا دائرہ حضرموت اور عمان تک پھیلا ہوا تھا۔



ابن سعود نے کئی ماہ تک ان وحشیوں کے ساتھ زندگی بسر کی۔ اس زندگی نے اسے ایک مضبوط اور بہادر بدوی بنا دیا۔ وہ بغیر سایہ کے کھلے میدانوں میں سوتا، ان کے ساتھ سفر کرتا، لوٹ مار میں ان کا شریک رہتا اور خوب شکار کرتا تھا۔ بنی مرہ نے بھی اسے اکثر رگستان فی گز بتلا دیے کہ کس طرح ریت پر پیہر کے نشانوں سے راستہ تلاش کیا جاتا ہے اور کیونکر طویل سفر میں اس میں اونٹوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے ان کی بیماریوں کا کیا علاج ہے، کھجواؤ

دودھ کی ایک مشک کے ساتھ کیسے ریگستان میں طویل سفر طے کیے جاتے ہیں؟ یہ سب باتیں ابن سعود کی آئندہ زندگی کے لیے معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ثابت ہوئیں جن سے اس نے آگے چل کر خوب فائدہ اٹھایا۔ عبد الرحمن کو یہ وحشیانہ زندگی مطلقاً ناپسند تھی۔ باشندگان مکرہ جاہل اور لاذہب تھے۔ ان کی بدتمیزی سے عبد الرحمن کے غرور اور مذہبی احساسات کو ٹھیس لگتی تھی اس نے انہیں آل رشید کے خلاف ابھارنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی آزاد اور خود مختار زندگی چھوڑ کر ان جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ عبد الرحمن نے اس خصوص میں اکثر قبائل کے شیوخ کو تفصیلی خط لکھے لیکن سب نے اسے خطرناک انسان سمجھ کر ٹکا سا جواب دیدیا۔

عبد الرحمن کو اس سے سخت ناامیدی ہوئی۔ عمر بھی اب بیچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ چاہتا تھا کہ اپنے بال بچوں میں کچھ دن آرام کی زندگی بسر کرے۔ لیکن حالات اس کے موافق نہ تھے۔ اسی اثناء میں کویت (بندرگاہ) کے شیخ محمد نے بسے کویت آنے کی دعوت دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں احسا میں ایک نیا ترکی حاکم حافظ پاشا نامی آیا ہوا تھا، رشید کی قوت بڑھتی جا رہی تھی اور وہ آئے دن ترکوں اور بندرگاہ کویت: دونوں کے لیے خطرناک ثابت ہو رہا تھا اس لیے گورنر نے رشید کے زور کو کم کرنے کے لیے عبدالجزسلی کی ضرورت محسوس کی اور کویت کے شیخ کے توسط سے بلا بھیجا اور ولیفہ



---

دینے کا وعدہ کیا۔ اندھا کیا چاہے ؟ دو آنکھیں۔ عبدالرحمن نے  
شیخ کی دعوت کو خوشی سے لبیک کہا اور کویت آکر اپنے بال بچوں  
کو بحرین سے بلوالیا اور یہیں رہنے لگا۔

# تیسرا باب

## ریاض کی فسح

(۱)

کویت ایک ریگستانی شہر تھا، سرسبزی و شادابی نام کو نہ تھی یہاں سعودی خاندان، ایک چھوٹے سے مکان میں پناہ گزین ہوا جس میں صرف تین کمرے تھے۔ اتنے بڑے خاندان کے لیے اتنا چھوٹا سا مکان کیا کافی ہوتا؟ محل کی زندگی کے بعد یہ ایک قید خانہ معلوم ہوتا تھا ہر حال یہ خاندان بڑی حسرت کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزار رہا تھا و طیفہ بھی وقت پر بہت کم ملا کرتا۔ کیونکہ خود ترک شیخ کو دیر سے رقم دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ شیخ بذات خود سعودی خاندان کا سرے سے مخالف تھا اور وہ تو صرف ترکوں کا اشارہ تھا جو اس نے اس خاندان کو پناہ دی۔ تھوڑے دن بعد ترکوں نے عبدالرحمن کو ترکی فوج کے ساتھ

ریاض پر چڑھ کرنے کے لیے کہا۔ اس نے انکار کر دیا۔ وہ ترکوں کے ہاتھ میں کٹ چلی بن کر کام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلے تو ان کے اس طرح حکم دینے کی وجہ سمجھیں نہ آئی۔ جب معلوم ہوا کہ اسے وظیفہ ترکوں کی طرف سے ملا کر آہے تو اس کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی لیکن کڑا کیا؟ پہلے ہی اسے اگر اس کا علم ہوتا تو ترکوں سے امداد لے کر زندہ رہنے کے بجائے وہ فاقہ کی موت کو ترجیح دیتا مگر اب اس کی حالت سقیم تھی اور رقم کی واپسی امکان سے باہر۔ جہر و ویشس بجان درویش کے پیچ و تاب میں رہا۔ ترکوں نے بھی اس کا یہ طور دیکھ کر وظیفہ بند کر دیا۔ اب اس خاندان پر بڑی مصیبت آپڑی۔ کھانے اور کپڑے کی بھی محتاجی ہو گئی۔ قرضے کے سوائے اور کوئی دوسری صورت نہ تھی۔ عبدالرحمن کی غیرت کسی کے آگے ہاتھ پھیلائی حامی نہیں بھرتی تھی۔ لیکن عسرت نے اسے اس کے لیے بھی مجبور کر دیا۔

جب ابن سعود کی عمر پندرہ سال کی ہوئی تو اس کی ماں نے ایک بدوی لڑکی سے اس کی شادی کی قرارداد کر لی لیکن شادی کے موقع پر عبدالرحمن کے پاس پیسہ نہ تھا اس لیے شادی ملتوی کرنی پڑی مگر عین وقت پر ایک سوداگر نے بہت ہی کشادہ پیشانی سے ان کی امداد کی اور ابن سعود کی شادی ہو گئی۔ کویت کی زندگی ابن سعود کے لیے تجربات کی ایک وسیع دنیا تھی۔

اب تک وہ صرف ریاض کی نری مذہبی زندگی اور ریگستان کے رہنے والے مرہ قبائل کے وحشی پن سے واقف تھا اس کے سوائے

جدید تمدن کی اسے ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ یہاں آنے کے بعد ابن سعود کی آنکھیں کھل گئیں۔ کویت اس زمانہ میں خلیج فارس کا ایک عظیم شان بندرگاہ تھا۔ بیسویں، طہران، دمشق، ترکی، انگلستان وغیرہ سے تاجر یہاں آیا کرتے اور یہیں سے وسط عرب اور شام کے لیے قافلے روانہ ہوا کرتے۔ کویت کی آبادی کافی تھی اور شہر میں خاصی چہل پہل رہتی تھی۔ ابن سعود بھی یہاں ایک معمولی عرب نوجوان کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ ساحل پر جا کر ایک وہ ملاح کی گفتگو سنتا، موٹلوں میں مسافروں اور تاجروں سے مختلف قسم کی باتیں ہوتیں، بغداد، دمشق اور قسطنطنیہ کی خبریں سنا کرتا اور بیرونی ممالک کے باشندوں کے حالات تفصیل کے ساتھ دریافت کرتا تھا۔ اپنے ہم عمروں سے ہنس بول لیا کرتا اور کبھی ان سے لڑتا بھڑتا بھی تھا۔ نماز کے وقت اپنے باپ کے ساتھ برابر سجد جاتا اور نہایت پابندی سے روزے رکھتا تھا۔ ابن سعود کبھی ساحلی تماش بینوں کا شکار نہیں بنا، اس کے دو وجوہ تھے، ایک تو نہایت خود سخت مذہبی تھا اور دوسرے اسکی شادی ہو چکی تھی۔ یہ چیز اس کی زندگی کو کامیاب بنانے میں بڑی مفید ثابت ہوئی، ورنہ ایک نوجوان کا جو دنیا کے اتار چڑھاؤ سے بے بہرہ ہو اور جس نے اپنی ابتدائی زندگی وحشیوں میں گزاری ہو، ساحلی بدعنوانیوں میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی کو تباہ و برباد کر دینا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔

اس زمانہ میں کویت کا شیخ 'محمد تھا اس کے بھائی 'مبارک کے  
عبدالرحمن کے اچھے تعلقات تھے۔ وہ اکثر ان کے پاس ملاقات  
کے لیے آتا تھا۔ محمد اور مبارک کے تعلقات بہت زیادہ ناخوشگوار  
تھے۔ چند سال پیشتر ان دونوں میں ناچاقی ہو گئی تھی اور مبارک  
ناراض ہو کر بمبئی چلا گیا تھا۔ یہاں اس نے اپنی تمام دولت جوے  
اور آوارگی کی نذر کر دی حتیٰ کے قرضوں کی ادائیگی میں اسے اپنی ماں  
کے زیورات بھی فروخت کرنے پڑے اور آخر میں جب وہ بالکل قفاش  
ہو گیا تو کویت واپس آنے کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔ محمد نے بھائی  
ہونے کی حیثیت سے اپنے پاس تو رکھا لیکن اسے اس سے سخت  
نفرت تھی۔ مبارک عام طور سے بہت مخمور و ملنسار واقع ہوا تھا۔  
جس کے باعث اسے رعایا بہت چاہتی تھی۔ یہ چیز محمد کو بُری طرح  
کھٹکتی رہی اور اسی سے وہ خائف بھی تھا۔ محمد نے مبارک کو ہمیشہ  
پیسے سے مجبور رکھنے کی کوشش کی اور جب بھی موقع ملا اسے عوام میں  
ذلیل کرنے سے نہیں چکا۔ مبارک ابن سعود پر بہت مہربان تھا  
بلکہ اسے اپنے بیٹے کی طرح چاہتا تھا اور اپنے گھر بلا کر اکثر اس سے  
کام کی باتیں کیا کرتا تھا۔ کچھ دن بعد حالات بالکل بدل گئے۔ مبارک  
اپنے بھائی کے سلوک سے تنگ آ کر ایک بھائی کی مدد سے اسے قتل  
کر ڈالا اور کویت کا شیخ بن بیٹھا۔ شہر والے محمد کی کنجوسی اور مظالم سے

تنگ آگئے تھے۔ مبارک کی وریا دلی اور فیاض طبیعت نے ان کے دل کو  
 پہلے ہی سے سوا لیا تھا۔ رعایا نے اس کی حکومت کو خوش آمدید کہا۔ مبارک  
 کی دوستی کے باعث سعودی خاندان کو شہرت ہونے لگی۔ مبارک کا  
 سلوک بھی ان لوگوں کے ساتھ نہایت اچھا تھا۔ ابھی مبارک کو شیخ  
 بنے ہوئے کچھ دن ہی گزرے تھے کہ ریاض سے خبر آئی کہ نجد اور  
 اطراف کے قبائل رشیدیوں کے خلاف بغاوت کے لیے تیار ہیں۔  
 بشرطیکہ کوئی ان کی رہبری کرے۔ ابن سعود کی عمر اس وقت سترہ سال  
 کی تھی۔ جیسے ہی اس نے یہ خبر سنی قیادت کے لیے تیار ہو گیا اور فوراً  
 ایک اونٹ متعارفہ کر اپنے چند سر بھرے ساتھیوں کے ہمراہ ریاض  
 کی طرف روانہ ہوا۔ یہ اطلاع بے بنیاد تھی۔ اہل ریاض بغاوت کے  
 لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ مبارک نے بھی ابن سعود کو کچھ امداد نہیں دی کیونکہ  
 وہ خواہ مخواہ اور ایسے نازک وقت میں رشیدیوں سے الجھنا عقلندہ کی  
 خلاف سمجھتا تھا۔ ابن سعود کا یہ جوش حقیقت میں بچپن تھا کہ وہ بغیر سوچے  
 سمجھے اس قدر اہم کام کے لیے بلا کسی امداد کے روانہ ہو گیا اور وہ بھی  
 ایک بوڑھا اور بیمار اونٹ لیکر راستہ میں اس کا اونٹ لنگڑا ہو کر گرا اور  
 مر گیا۔ اسے وہاں سے واپس لوٹنا پڑا۔ اتفاق سے رستہ میں ایک قافلہ  
 مل گیا۔ ان لوگوں نے اسے سامان کے اونٹ پر بٹھا کر کویت پہنچا دیا  
 جب ابن سعود اپنے مقام پر پہنچ گیا تو تمام لوگوں نے اس کی طفلانہ حرکت  
 کا خوب مضحکہ اڑایا۔

اس اثناء میں واقعات نے کچھ ایسا پٹا دکھایا کہ ان واحد میں کویت کو عالمگیر شہرت حاصل ہو گئی۔ وہ اس طرح سے کہ جرمنی میں آبادی اور قوت حد سے زیادہ ہو گئی تھی۔ قیصر چاہتا تھا کہ اپنی سلطنت کو وسعت دے لیکن کس طرح؟ وسعت کا راستہ صرف مشرق کی طرف کھلا ہوا تھا اور ہندوستان پر ان کی نظریں گڑی ہوئی تھیں۔ سب راستے انگریزوں کے قبضہ میں تھے۔ البتہ ایک راستہ کھلا تھا جو ترکی سے ہوتے ہوئے مالک عرب سے گذرتا ہوا خلیج فارس میں پہنچتا ہے۔ اس لیے قیصر نے سلطان ترک سے دوستی کر لی انہیں اسلام کا غلیفہ اور عربوں کا محافظ تسلیم کر لیا اور مشرق میں اپنے لوگ روانہ کیے۔ اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے وہ قسطنطنیہ سے علی پو اور پھر بغداد تک ریل کی پٹری ڈالنا اور کویت کو جنگلشن بنانا ضروری خیال کرتا تھا کیونکہ کویت ہی خلیج فارس کی کنبی تھی۔

انگریز بھی کچھ نہیں تو برابر ایک صدی سے ہندوستان کی طرف سے خلیج فارس کے لیے زور مار رہے تھے اور ساحل کے مقامی شیوخ سے اتحاد پیدا کر کے اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ اب جب انہوں نے دیکھا کہ جرمن اس کے لیے کوشاں ہے تو وہ کیسے خاموش بیٹھ سکتے تھے؟ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی طرح جرمنی ان کے راستہ میں شامل ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دونوں قوتیں ایک دوسرے کے مقابل آگئیں جس سے کویت کی اہمیت بڑھ گئی۔

مبارک بہت ہی جہاں دیدہ تھا۔ وہ موقع کی اہمیت اور اپنی حیثیت کو سمجھ گیا۔ انگلستان، روس، جرمنی سے اس کے پاس نمائندے آنے لگے۔ ان لوگوں کے منصوبوں سے واقف ہونے کے لیے مبارک نے بھی اپنے جاسوس لگا دیے۔ اب وہ پہلے کی طرح آوارہ اور شرابخوار نہ تھا بلکہ ایک مستعد، ہوشیار اور معاملہ فہم انسان بن گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر جرمنوں کو ریل کی پٹری بچانے میں کامیابی ہو گئی تو بس کویت کا خدا حافظ ہے۔ وہ سب کو وعدہ فردا پر مالتا گیا۔

جرمنوں نے اس کی یہ فراست دیکھ کر ایک چال چلی اور سلطان ترکی سے مل کر اس پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور مغرول کرنے کی سازش کی گئی مبارک کو ان منصوبوں کی اطلاع ہو گئی اور وہ فوراً انگریزوں سے مل گیا۔ ترکوں نے رشیدیوں کا ساتھ دیا اور ان کے دل میں یہ بات بٹھادی کہ مبارک ان کے خلاف سعودیوں کو امداد دے رہا ہے۔ یہ بات رشیدیوں کے سمجھ میں آگئی اور انہوں نے فوراً کویت پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔

— (۳) —

مبارک بھی خطرہ کو تازہ کیا، اب وہ بڑی ادمیڑپن میں پڑ گیا۔ اس کے پاس نہ تو کافی فوج تھی اور نہ ہی کویت کے باشندے جنگ بدل اور مقابلہ کے اہل تھے۔ شہر کی تفصیل بھی بوسیدہ ہو چکی تھی اور محاصرہ کی مداخلت بھی اس کے بس سے باہر تھی، بہر حال اس نے آنے والے



خطرہ سے آگاہ ہو کر مداخلت کے انتظامات شروع کر دیے اور اطراف کے قبائل کے نام اتحاد کے لیے پروانے بھیجے۔ مرہ، عجمان، مطیر قبائل اور منطفاک کے شیخ سعدن نے اس کا ساتھ دیا۔ ساتھ ہی اس کے مبارک نے عبدالرحمن اور ابن سعود سے بھی اتحاد اور دوستی کا پیمانہ کر لیا اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ ضرورت کے وقت نجدیوں سے امداد دلائیں گے۔

لیکن اسی اثنا میں عبدالرحمن کو مبارک کی گزشتہ زندگی کے حالات معلوم ہو گئے جس سے وہ بدظن ہو گیا۔ اس کے علاوہ مبارک کا طرز زندگی بھی اسے کچھ بھاتا نہ تھا۔ وہ امیرانہ ٹھاٹ سے رہا کرتا تھا۔ زرق برق پوشاک پہنتا تھا۔ اس کا محل قیمتی فرنیچر اور چند تصویر بتاں سے آراستہ پیراستہ تھا۔ وہ نماز روزہ کا بھی کچھ ایسا زیادہ پابند نہ تھا بلکہ عورتوں کا گانا سنتا اور شراب پیا کرتا تھا۔ یہ سب باتیں وہابی عقائد (فی الحقیقت اسلام) کے خلاف تھیں اس لیے عبدالرحمن کو مبارک کی طرف سے نفرت پیدا ہو گئی اور اس نے اپنے لڑکے ابن سعود کو بھی اس کی صحبت میں رہنے سے منع کر دیا۔ مگر ابن سعود کسی خاص مقصد کے تحت خفیہ طور پر اس سے ملا کرتا تھا۔

مبارک اور ابن سعود میں بہت گہری دوستی ہو گئی۔ مبارک ہمیشہ اسے اپنے ہمراہ رکھتا اور اکثر معاملوں میں اسی سے مشورہ کرتا اور پیچیدہ معاملات کے نکات کو اسے بتلاتا تھا۔ اس سے ابن سعود کی معلومات میں اضافہ ہوتا گیا اب تک اسے اس قسم کی باتوں سے

دوچار ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ابن سعود کو پہلی دفعہ غیر ممالک کے لوگوں یعنی انگلستان، فرانس، اور جرمن کے نمائندوں سے ملنے، ان کی گفتگو سننے اور ان کے طرز زندگی کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مبارک ان سے خاص ڈھنگ سے بلا کر ملا تھا۔ حقیقت میں اسی کی ہمت اور اسی کا تجربہ تھا جو وہ کویت پر اس سنجیدگی کے ساتھ حکومت کر رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کویت مختلف قسم کے لوگوں کا مرکز تھا، بیرونی ممالک کے تاجر اکثر وہاں آیا کرتے تھے اور عرب کے اکثر علاقوں کو جانے والے قافلے وہیں سے ہو کر گذرتے تھے۔ مبارک کے لیے ان سب سے نبٹنا اور ان سب سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنا ضروری تھا۔

دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں کویت پر دنیا کی دو بڑی قوتیں دانت لگائے بیٹھی تھیں۔ ایسے نازک وقت میں اگر یہ ذرا بھی زردلی سے کام لیتا یا اس سے ذرا بھی لغزش ہو جاتی تو کویت ہمیشہ کے لیے اس کے کیا بلکہ عربوں کے قبضہ سے بھی نکل گیا ہوتا۔ اسی لیے اس نے میانہ طریق کا راستہ اختیار کر رکھا تھا اور اسی میں اس کی نجات تھی۔

ایسے زمانہ میں مبارک کا ساتھ ابن سعود کے لیے آیہ رحمت ثابت ہوا اور وہ رفتہ رفتہ مختلف قسم کی سیاسی چالوں اور مختلف استعداد کی حکومتوں سے نازک سے نازک مسئلوں پر گفت و شنید کرنے کے ڈھنگ سے روشناس ہوتا گیا پہلے ہی سے وہ بہت ذکی الطبع واقع ہوا تھا ان حالات نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا۔

ابن سعود میں اب خود اعتمادی پیدا ہوتی گئی وہ مستقبل کے خوش آئندہ خواب دیکھنے لگا اور اپنے ساتھیوں سے فخریہ انداز میں کہتا تھا کہ میں ریاض اور نجد کا دارلث ہوں اور ایک نہ ایک دن رشیدیوں کو ریاض سے بے دخل کر کے رہوٹھاں گا۔ سب لوگ اس کے باتوں پر ہنستے اور اس کی پہلی ہم کی یاد دہانی کر کے پختیاں اڑاتے لیکن ابن سعود ان باتوں سے پست بہت ہونے والا نہ تھا بلکہ اس کے ارادے پہلے سے زیادہ مضبوط ہونے لگے۔

————— (۴) —————

مبارک چاہتا تھا کہ رشیدیوں سے پہلے خود اس پر حملہ کر دیے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے حلیفوں کو جمع کیا اور جب دس ہزار آدمی جمع ہو گئے تو حملہ کے لیے روانہ ہوا اور اپنے ساتھ عبدالرحمن کو بھی لے لیا۔ عبدالرحمن نے ابن سعود کو جنوب کی طرف روانہ کیا تاکہ ادھر سے تھوڑی بہت قوت جمع کر کے ریاض پر حملہ کر دے۔ ابن سعود اپنے چچیرے بھائی جلوی اور نجد کے چند بہادر نوجوان ساتھیوں کو لیکر جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ اور ریگستان کے اکثر قبائل سے مل کر اپنے مقصد کو ان کے آگے پیش کیا۔ رشیدیوں کی سختیوں سے قبائل تنگ آ چکے تھے اور پھر سے سعودی حکومت کے خواہاں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر اور بیشتر قبائل نے ابن سعود کا ساتھ دیا اور جب وہ ریاض کی طرف بڑھا تو اس کے ساتھ ایک بڑی فوج تھی۔

اسی اثناء میں یکایک شمال سے خبر آئی کہ قصبہ سارف کے پاس

رشیدیوں کا مبارک سے مقابلہ ہوا۔ مبارک کے ہمراہیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ منطفک بھی انجان ہو گیا، عجائبیوں نے بھی وہ دی اور مبارک بے یار و مددگار رہ گیا اور اگر اس موقع پر زور دار بارش نہ ہوتی تو مبارک ٹھنڈا ہو گیا ہوتا۔ یہ خبر سن کر اکثر قبائل گھبرا گئے۔ ان پر پہلے ہی سے رشیدیوں کی دھاک تھی اب تو وہ بھی پریشان ہو گئے اور سبھوں نے چپکے سے گھروں کا رخ کیا۔ یہ حال دیکھ کر ابن سعود اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ کویت واپس آیا اس کے کچھ بعد ہی رشید ریاض پہنچا اور ستر کے طور پر اس نے نجد کے اکثر گاؤں جلوادیے شہر بریدہ میں ایک سو اسی سرداروں کو سولی دی اور دو سو روئے سخت جرانے کیے۔ یہاں سے وہ مبارک کی طرف پلٹا۔ مبارک بالکل بے بس تھا اس کے دوستوں نے عین وقت پر اس کا گلا کاٹا۔ اس کے پاس فوج تھی اور نہ ہی اس کا شہر فضیل سے محصور تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سعودی خاندان بھی جھک کر ٹپے میں آ گیا۔ عبدالرحمن نے ارادہ کیا کہ دشمن آنے سے پہلے ہی فرار ہو جائے لیکن اس اثناء میں انگریز آ گئے۔ انہوں نے مبارک کا ساتھ دیا اور رشید کو واپس جانے کی دھمکی دی۔ رشید واپس چلا گیا۔

(۵)

رشید نے مبارک کو علانیہ شکست دیدی تھی۔ یہ تو انگریزوں کی وجہ تھی کہ وہ بال بال بچ گیا ورنہ اگر انگریز بچ میں نہ آتے تو رشیدی

مبارک کی حکومت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیتے۔ لیکن اس کے باوجود ابن سعود اس کو شکست تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اس کی عمر اس وقت بیس سال کی تھی۔ وہ مضبوط نمونہ، دلیر اور مستقل مزاج بدوی تھا اس میں جوانی اور خاندانی شرافت کا خون موجیں مار رہا تھا۔ اس کی بھوری آنکھوں سے غصہ کے مارے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے عمایوں کو لعنت ملاست کی وہ باغی فاسق اور فاجر تھے۔ اپنے ساتھیوں کے سولی دیے جانے پر وہ آگ بگولا ہو گیا اور مبارک کو جنگ کے لیے اُبھارا لیکن اس نے اپنی حالت کا اندازہ کر کے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد خود اس نے مختلف قبائل کے شیوخ سے مل کر امداد چاہی لیکن سمجھوں نے سارے کا قصہ سنا کر سکوت اختیار کیا ابن سعود کو ہر طرف سے ناکامی ہو گئی اب ابن سعود بے حد بے چین تھا، کاہلی کی زندگی سے وہ قبر کے گوشہ کو زیادہ آرام دہ سمجھتا تھا۔ لوگوں کے طعنوں تشنوں سے اس کا کلیجہ مند کو آنے لگا۔ وہ جنگ کے لیے بالکل تیار ہوا تھا۔ عبدالرحمن نے اسے بہت کچھ روکا اور اس کے بھڑکے ہوئے جذبات کو دبانے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہ مانی۔ اہل نجد پر اسے کامل بھروسہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ اگر ان کی مناسب رہبری کی گئی تو وہ رشیدیہ کو بے دخل کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ ابن سعود اپنے خیال کی تکمیل کے لیے ہر طرح تیار تھا۔ لیکن اس کے پاس روپیہ پیسہ اونٹ اور آلات حرب کی کمی تھی ورنہ کبھی کا وہ اس ہم کے لیے

روانہ ہو جاتا۔ مبارک سے اس نے امداد کے لیے درخواست کی۔ مبارک ایک سنجیدہ اور جہاں دیدہ انسان تھا۔ اس نے پہلے تو سمجھایا بجھایا اور سالانہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی مگر ابن سعود اپنی بات پر اڑا رہا۔ بالآخر مبارک نے مجبور ہو کر بادل ناخواستہ تیس اوٹ، بیس بندوقیں اور دو سو ”ریال“ (ایک قسم کا سکہ) اس کے حوالہ کیے۔

اب کیا تھا، ابن سعود کی مُراد برائی۔ اس نے ذرا بھی وقت ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی دو بیویوں اور پہلی مرحومہ بیوی کے لڑکے ترکی کو والد کے پاس چھوڑ کر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔

ان میں جلوئی اور اس کا بھائی محمد بھی شامل تھا۔ سفر کی پوری تیاری کے بعد ابن سعود رشتہ داروں سے ملنے کے لیے گھرایا۔ ماں باپ نے بہتیرا سمجھایا کہ ابھی وقت نہیں آیا لیکن اس کی بہن قورمی نے باپ کی بات کاٹ کر بھائی کی ہمت افزائی کی۔ وہ ابن سعود سے زیادہ جوش میں تھی۔ بالآخر عبدالرحمن نے رخصت کی اجازت دی اور یہ مختصر سا قافلہ ایک عظیم الشان مقصد کے ساتھ رات کی تاریکی میں ریگستان کی طرف روانہ ہوا۔ ابتدا ہی سے ابن سعود کو کامیابی ہوتی گئی کیونکہ ریگستانی سفر کے متعلق وہ مرقہ میں کافی معلومات حاصل کر چکا تھا۔ اس تجربہ بنے یہاں اس کی بڑی رہبری کی اور قافلہ تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ راستہ میں اگر مخالفین کا کوئی قافلہ یا گروہ مل جاتا تو یہ لوگ مار پیٹ کر کے روپیہ پیسہ اور آلات حرب جبین لیتے

اور فوراً دوسری طرف۔ وہ میل تک نکل جاتے۔ ابن سعود راتوں کو بہت کم سوتا تھا۔ گرم ریت میں گڑھا بنا کر گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کر لیتا اور پھر اٹھ کھڑا ہوتا تھا۔ اور جب سب لوگ تھک کر سو جاتے تو خود ان کی حفاظت کیا کرتا تھا۔

ابن سعود کو رانی سے خاص شغف تھا اور وہ بھی دو بدو لڑائی سے۔ وہ شیر کی طرح گرجتے ہوئے دشمن پر حملہ کرتا اور ایسے وار لگاتا تھا کہ دشمن کی صفیں بکھر جاتی تھیں کسی شخص کو اس کے مقابلہ کی جرات نہ ہوتی تھی۔ اس کی اس بہادری کو دیکھ کر اس کے ساتھیوں کے دل اور بھی بڑھ گئے۔ احسا کے قریب اس نے ایک عجمانی اور ایک رشیدی قافلہ کو لوٹ لیا اس طرح بہت سامان غنیمت اس کے ہاتھ آ گیا۔ اب اس کے پاس کافی روپیہ جمع ہو گیا تھا اور ساتھ ہی ابن سعود بہت ہی دریا دل واقع ہوا تھا جس کے باعث بدوی اس کے اطراف جمع ہونے لگے۔ لیکن وہ ابھی مطمئن نہ تھا۔ کیونکہ اس کا مقصد بدویوں کو فراہم کر کے لوٹ مار کی زندگی بسر کرنا نہیں تھا بلکہ وہ نجد اور ریاض کے باشندوں کو رشیدیوں کے خلاف ابھارنا چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں ابن سعود کو کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ کچھ دنوں میں اس کی پونجی ختم ہو گئی اور بدویوں نے ساتھ چھوڑ دیا رشید نے اس کے تعاقب میں اپنی فوج روانہ کی ایک طرف سے ترکوں نے دبا نا شروع کیا۔ دوسری طرف سے عجمانی ٹوٹ پڑے اور عبدالرحمن نے بھی لکھ بھیجا۔

”ہم تمہارے لیے بے چین ہیں اور تمہیں کو بیت آنے کی نصیحت کرتے ہیں۔ یہ وقت مناسب نہیں ہے۔“

ان حالات نے ابن سعود کو سخت پریشان کر دیا۔ دوسرا کوئی کم ہمت ہوتا تو اس کے چھٹکے چھوٹ جاتے مگر ابن سعود ارادہ کا پکا اور مستقل مزاج تھا۔ جبرین کے پاس اس نے اپنے کل ساتھیوں کو جمع کر کے سب حالات من و عنان کے آگے پیش کر دیے اور ان سے صلح و مشورہ کیا۔ وہ بذاتِ خود لڑنے مرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے کہا کہ جو لوگ ساتھ دینا چاہتے ہیں، ٹھہریں اور جو واپس جانا چاہتے ہیں خوشی خوشی جاسکتے ہیں۔ چند آدمی چلے گئے اور اس کے پاس تیس آدمیوں کے علاوہ اور چالیس آدمی اور ان کے غلام اور جلوی اور اس کا بھائی محمد اس کے ساتھ ہو گئے۔ مختصر جماعت اب ہر طرف سے دشمنوں کے زرخے میں تھی۔ اس سے وہ سبت ہمت نہیں ہوا۔ چنانچہ ایک دفعہ اس نے اپنے باپ کے پاس کے پیغام سے کہا۔

”جاؤ اور جا کر والدہ سے وہ سب کچھ کہدو جو تم نے دیکھا اور سنا ہے ان سے یہ بھی کہدو کہ میں کسی حالت میں بھی اپنے ملک کو رشیدیوں کے ہاتھ میں اور خاندان کو اس تباہ اور برباد حالت میں دیکھ نہیں سکتا۔ نا کافی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے سب کچھ خداوند کریم کے ہاتھ میں ہے۔“

اس کو اپنے خدا اور اپنے ضمیر کی آواز پر کافی بھروسہ تھا!!



اب ابن سعود میں پہلے کا سا وحشیانہ پن نہ تھا بلکہ وہ دن بدن  
 سنجیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ بہت غور سے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد  
 وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ لوٹ مار فضول ہے۔ مٹی بھر آدمی نہ تو بڑی  
 فوج کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی لوگوں کا اعتماد حاصل کر سکتے ہیں  
 ایسی صورت میں اس نے یہ مناسب خیال کیا کہ کوئی ایسی عجیب و غریب  
 حرکت کی جائے کہ تمام لوگ اس سے چونک پڑیں۔ فوراً اس کے ذہن میں  
 ایک خیال آیا اور اس نے اپنے جاسوس ریاض کی طرف روانہ کر دیے۔  
 جاسوسوں نے اطلاع دی کہ ریاض میں کافی فوج ہے وہاں کا عامل ایک  
 شہری شیخ بھلان ہے جو قلعہ کے سامنے والے مکان میں رہتا ہے۔  
 ریاض اور سارے نجد کے لوگ غیر مطمئن ہیں رشیدیوں سے انہیں سخت  
 نفرت ہے اور پھر سے وہ سعودی حکومت کے خواہاں ہیں لیکن انہیں صرف  
 ایک رہبر کی ضرورت ہے۔ یہ حالات بلاشبہ ابن سعود کی تائید میں تھے۔  
 لیکن معدودے چند آدمیوں کو لیکر ریاض پر حملہ کرنا جان بوجھ کر موت  
 منہ میں جانا تھا اس وقت اس نے یہ ایک تجویز پیش کی کہ اگر ہم لوگ پچاس دن  
 تک خاموشی سے بیٹھے رہیں تو مخالفین یہ سمجھیں گے کہ ابن سعود تباہ و برباد ہو گیا  
 اس کے ہمراہیوں نے ساتھ چھوڑ دیا ہو گا۔ مگر یہ تجویز اس کے ساتھیوں کو  
 پسند نہ آئی وہ اپنے بیوی بچوں کے لیے بے چین تھے۔ جنگ کے بغیر  
 ایسی خاموش زندگی انہیں قطعاً پسند نہ تھی۔ بریں ہم ابن سعود نے

انہیں سمجھا بجا کر راضی کر لیا۔ یہ گردہ اب نہایت ہوشیاری کے ساتھ رگیتانوں میں چھپا ہوا زندگی بسر کر رہا تھا۔ کھجوروں اور رگیتانی چشموں کے خلیط پانی پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ یہ دن بڑی بے چینی اور الجھن میں گزرے۔ مذاخذ کر کے رمضان کا مہینہ آپہنچا اور ابن سعود جلوی اولین کے دوسرے اکثر ساتھی پابندی سے روزے رکھنے لگے۔ بیویوں نے رمضان کو افطار کے بعد ابن سعود نے کوچ کا حکم دیا۔ آخری مہینہ تھا اور رات میں تاریک۔ اسی لیے یہ قافلہ لوگوں کی آنکھ بچا کر رات میں سفر کرتا اور دن میں قیام کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ سفر بڑی سستی کے ساتھ طے ہو رہا تھا اور دن بھی لاغر اور بے دم ہو چکے تھے اور کھانے کو بھی پاس کچھ نہ تھا۔ الغرض ابو حنیفان کے چشموں کے پاس اس خانہ بدوش قافلہ کی عید ہوئی۔ عید کرنے کے بعد یہ لوگ طوین کی پہاڑیوں کے دامن سے ہوتے ہوئے دل اششی کے نخلستان کے پاس پہنچے یہاں سے ریاض پیدل دیرھ گھنٹہ کا راستہ تھا۔ اس مقام پر اس نے بیس آدمی اونٹوں کے ساتھ چھوڑ دیے اور کہا

”میں ریاض جا رہا ہوں جب تمہیں بلاؤں فوراً آ جانا اور اگر نہ آ سکو تو کویت واپس جا کر اطلاع دیدینا کہ میں یا تو مرجحہا ہوں یا رشیدیوں کی قید میں ہوں“

اس کے بعد ابن سعود اللہ کا نام لیکر کھجور کے درختوں کے سایے تلے سے ہوتا ہوا ریاض کی طرف چلا۔ شمس کی مقام پر پہنچنے کے بعد اس نے

کھجور کے ایک درخت کو کاٹ کر سیڑھی بنائی اور جلوی اور چھ آدمیوں کو لیکر باقی کو محمد کے ساتھ وہیں چھوڑ دیا۔ اور کہا  
 ”دیکھو اگر کل تک تمہیں ہماری کچھ خبر نہ ملے تو فوراً گھر کا رخ کرو۔ اور  
 سمجھ لو کہ ہمارا خاتمہ ہو چکا ہے۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ“

————— ( ۷ ) —————

جلوی اور اپنے چھ آدمیوں کو لے کر ابن سعود لوگوں کی نظروں سے  
 بچتا ہوا قلعہ کی دیوار کے پاس پہنچا اور ایک مقام پر موقع پا کر سیڑھی کے  
 ذریعہ شہر میں داخل ہوا۔ یہ وسط جنوری کا مہینہ تھا۔ سرد ہوا میں کثرت  
 کے ساتھ چل رہی تھیں اس لیے اہل شہر اپنے اپنے گرم بستروں پر آرام کی  
 نیند سو رہے تھے۔ یہ چند آدمی اپنے ہتھیاروں کو کپڑوں میں چھپا کر خالی  
 گلیوں میں سے ہوتے ہوئے جو اسیر چرواہے کے مکان پر پہنچے جو  
 عامل ریاض کے مکان کے قریب رہتا تھا۔ ابن سعود دروازہ کھٹکھٹایا  
 اندر سے ایک عورت نے پوچھا ”کون ہے؟“ ابن سعود نے جواب دیا۔  
 ”میں عامل کے پاس سے آیا ہوں جو اسیر سے دو گائیں خریدنی ہیں“  
 عورت نے ڈانٹ کر کہا ”چلے جاؤ تم ہمیں کوئی بازاری عورتیں سمجھتے ہو“  
 نکل جاؤ۔ اتنے وقت گئے جب کہ گھر میں مرد نہ ہوں دروازہ کھٹکھٹانا  
 ٹھیک نہیں۔“

”اگر تم نے دروازہ نہیں کھولا تو میں عامل صاحب سے کہہ دوں گا اور پھر کل وہ  
 جو اسیر کی خبر لینگے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ بازو ہٹ گیا۔

کچھ دیر بعد ایک آدمی اندر سے نکلا۔ ابن سعود کے آدمیوں نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اور فوراً اس کے منہ میں کپڑا ٹھوس دیا۔ اور سب کے سب دروازہ کھول کر مکان میں داخل ہو گئے۔ شیخص پہلے محل کا ملازم تھا۔ جیسے ہی اس نے ابن سعود کو دیکھا چلا اٹھا۔ ”ارے یہ تو ہمارے آقا عبدالعزیز ہیں۔“ یہ سن کر گھر کے سب لوگ اس کے اطراف جمع ہو کر ادب سے سرنگوں کھڑے ہو گئے۔ یہ ملازم بہت سی اہم باتوں سے واقف تھا۔ اس نے بیان کیا کہ قلعہ میں رشید کے سپاہی موجود ہیں۔ انہیں کسی حملہ کی توقع ہے اور نہ وہ اس کی ممانعت کے لیے تیار ہیں۔ حاکم باہموم قلعہ میں سوتا ہے۔ دن نکلنے کے بعد وہ گھوڑوں کا معائنہ کرتے ہوئے کبھی پیدل اور کبھی گھوڑے پر اپنے مکان آتا ہے۔ محافظ دستہ کے بغیر وہ گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ اس کا گھر جواسیر کے مکان سے ایک مکان بعد کو تھا۔ اس پر کوئی پہرہ نہ تھا۔

ابن سعود نے مکان کی چھت پر چڑھ کر عجلان کے مکان کا رخ کیا اور بازو اٹھ کر مکان میں داخل ہوا۔ مالک مکان اور اس کی بیوی دونوں محو خواب تھے۔ اس کے آدمیوں نے انہیں اس طرح بائیدہ دیا کہ وہ آواز نہ کر سکیں۔ عامل کا مکان بادوبہ ہی تھا۔ یہ دو منزلہ عمارت تھی اس لیے ابن سعود کے ساتھی ایک دوسرے کے کندھوں پر چڑھ کر چھت پر پہنچ گئے اور کچھ دیر کے لیے خاموش لیٹ گئے تاکہ یہ معلوم کر سکیں کہ کوئی ان کی نقل و حرکت کو دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ جب انہیں

ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تو آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے وہ مکان میں داخل ہوئے۔ چند آدمی دالان میں سو رہے تھے انہوں نے پھرتی سے انہیں باندھ کر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا اور باقی آدمیوں کو چھوڑ کر ابن سعود اور جلوی عامل کی خواہگاہ میں پہنچے۔ یہاں دو عورتیں تھیں۔ ایک تھ عامل کی بیوی اور دوسری اس کی بہن، یہ دونوں انہیں دیکھ کر سہم گئیں ابن سعود عامل کی بیوی مطلبہ کو پہچان لیا کیونکہ یہ محل کے ایک ملازم کی لڑکی تھی۔ ابن سعود نے بڑھکر مطلبہ کے اور جلوی نے عامل کی بہن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور ابن سعود نے کہا

”مطلبہ خاموش رہ ورنہ میں تجھے مار ڈالوں گا تو بڑی بد ذات ہے کیونکہ تو نے ایک شامری سے شادی کی ہے“

مطلبہ نے سکتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”سرکار میں بد ذات نہیں ہوں جب آپ لوگوں نے ہمیں چھوڑ دیا تب میں نے شادی کر لی۔ فرمائیے آپ کا یہاں آنا کیسے ہوا؟“

”میں مجملان کو قتل کرنے آیا ہوں۔“

”مجملان قلعہ میں ہے اور اس کے ساتھ کم از کم اسی آدمی ہیں اس لیے بہتر ہے کہ اس سے قبل کہ وہ آپ کو دیکھ کر قتل کر ڈالے، آپ یہاں سے چلے جائیے۔“

”وہ مکان کب واپس آتا ہے؟“

”صبح ہونے کے کوئی ایک گھنٹہ بعد“

”اچھا تو تم لوگ اب خاموش رہو اگر ذرا بھی آواز نکلی تو گلا گھونٹ دوں گا۔“  
 یہ کہہ کر ان عورتوں کو ملازمین کے ساتھ بند کر دیا۔ اب دن نکلنے میں صرف  
 چار گھنٹے باقی رہ گئے تھے۔ ابن سعود بازو کے کمرے میں آیا۔ اس کی کھڑکیاں  
 کھلی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ قلعہ کی فصیل اور اس کا  
 مضبوط دروازہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ فصیل پر ایک سپاہی پہرہ  
 دے رہا تھا۔ اور چو طرف خاموشی چھانی ہوئی تھی۔

ابن سعود اپنے دو آدمیوں کو محمد اور اس کے ساتھیوں کو بلانے  
 کے لیے بھیجا۔ یہ آدمی بہت جلد آ گئے۔ ابن سعود نے مکان کی کھڑکیوں  
 پر پہرے لگا دیے۔ اب ایک ایک پل بڑی شکل سے گزر رہی تھی۔ بالآخر  
 بسحوں نے فجر کی نماز ادا کی اور مسلح ہو کر آفتاب کے طلوع ہونے کا انتظار  
 کرنے لگے۔

(۸)

سورج طلوع ہونے کے کچھ دیر بعد ابن سعود کے ایک آدمی نے جو  
 کھڑکی پر پہرہ دے رہا تھا آواز دی۔ ابن سعود کھڑکی کی طرف گیا۔ سامنے  
 کے میدان میں غلام گھوڑوں کو لیے جا رہے تھے اور قلعہ کے اندر چل  
 شروع ہو گئی تھی۔ ابن سعود نے آخری احکامات دیدیے اور چار آدمیوں  
 کو کھڑکیوں پر تعین کر کے تاکید کی کہ جیسے ہی عجلان قلعہ سے باہر نکلے  
 بند و قیں چلائی جائیں۔ اتنے میں قلعہ کا دو ہر اچھا ٹاک کھلا اور عجلان  
 اپنے محافظ دستہ کے ساتھ قلعہ کے باہر آیا۔ ادھر ابن سعود اپنے

آدمیوں کو ساتھ لے کر شیر کی طرح گرجتا ہوا عجلان کی طرف جھپٹا۔ عجلان نے  
 بھی تلوار کھینچ لی۔ اور ابن سعود پر وار کیا۔ ابن سعود نے اس وار کو اپنی  
 بندوق پر روک لیا اور دونوں گتھ پڑے اور لڑتے لڑتے زمین پر گر گئے  
 یہ حال دیکھ کر محافظ دستہ کے سپاہی تتر بتر ہو گئے اور قلعہ کی طرف بھاگے  
 گئے۔ ان میں سے ایک سپاہی نے ابن سعود پر وار کیا لیکن جلوی وہیں  
 کھڑا تھا۔ اس نے نہ صرف وار روکا بلکہ ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کے  
 دو ٹکڑے ہو گئے۔ عجلان بڑی ہمت سے مقابلہ کرتا تھا۔ لیکن کب تک؟  
 طاقت جواب دینے لگی۔ وہ چاہتا تھا کہ قلعہ کی طرف بھاگ سکے لیکن  
 ابن سعود نے بندوق چلائی جس سے اس کا بازو زخمی ہو گیا اور تلوار  
 ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اندر سے قلعہ کے سپاہی دوڑتے ہوئے آئے  
 ادھر سے ابن سعود کے آدمی آگھے اور قلعہ کی پھاٹک کے پاس  
 یہ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ ایک تہلکہ مچ گیا۔ فصیل پر سے سپاہیوں نے  
 گولیاں چلائیں اور پتھر برسائے گئے۔ ابن سعود کے بازو ایک آدمی  
 تھا اُسے ایک گولی لگی اور وہ وہیں ختم ہو گیا۔ ایک اور سپاہی بھی زخمی ہوا۔  
 اب عجلان کے سپاہی ابن سعود کے مقابل تھے اور یہ برابر ان کے  
 حملوں کو روک کر ان پر وار کیے جا رہا تھا۔ اسی طرح لڑتے لڑتے وہ  
 عجلان سے قریب ہوا۔ عجلان نے لیٹے لیٹے ابن سعود کو ایک لات  
 ماری جس سے اُسے سخت چوٹ آئی۔ سپاہی قلعہ کا پھاٹک  
 بند کرنا چاہتے تھے لیکن جلوی اپنے تین آدمیوں کے ساتھ نہیں برابر

روک رہا تھا۔ اسی اثنا میں عجلان نے مسجد کا رخ کیا لیکن جلوی نے  
مسجد کی سیڑھیوں پر اس کے دو ٹکڑے کر دیے۔

عجلان کے قتل کے بعد ابن سعود اپنے آدمیوں کو لے کر قلعہ میں  
گھسا، کچھ آدمی فضیل پر چڑھ گئے اور کچھ شہر میں جا کر ابن سعود کی فتح کا  
اعلان کرنے لگے۔ اہل ریاض خواب سے بیدار ہوئے۔ وہ پہلے ہی سے  
رشیدیوں کے مظالم سے تنگ آچکے تھے۔ انہوں نے سعودی حکومت  
کا خیر مقدم کیا۔ اب ابن سعود ریاض کا حاکم تھا !



# پو تھا باب رشی دیوں کی شکست

( ۱ )

ابن سعود کی یہ درخشاں کامیابی تھی۔ مٹی بھر آدمیوں سے نجد کے ایک ممتاز شہر کو فتح کرنا، واقعی قابل تعریف اور جوانمردی کا کام تھا !  
ابن سعود اب ریاض کا حاکم تھا لیکن اس سے کیا ہوتا ؟ نجد کے قبائل کا اتحاد ضروری تھا۔ ایسی اتفاقی فتح سے اہل ریاض مطمئن نہ تھے۔  
یہ ان کا بار بار کا تجربہ تھا کہ آج ایک گاؤں یا شہر فتح ہوا اور پھر دوسرے روز ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے علاوہ گزشتہ سالوں سے سعودیوں کو رشی دیوں کے مقابلہ میں مسلسل شکست ہو رہی تھی، پھر کس طرح نجد کے باشندوں کو ایک نا تجربہ کار فوجان کی اس اتفاقی فتح سے اطمینان حاصل ہو سکتا تھا ؟  
نجدی قبائل نے سعودیوں کی طرف داری کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا۔ البتہ

اہل ریاض اور دوسرے سو آدمیوں نے اس کا ساتھ دیا۔ بجلا اتنی قلیل  
شمارہ و شامروں کی باقاعدہ فوج کے ساتھ کیا مقابلہ کر سکتی؟

بہر حال آگے چل کر خواہ اونٹ کسی بھی کروٹ بیٹھے، اس وقت تو  
ابن سعود ریاض کا حاکم تھا اور اہل ریاض اس کے ہم نوا تھے۔ قلعہ کی  
دیوار شکستہ ہو گئی تھی، انہوں نے دن رات کی محنت سے اسے تعمیر  
کر دیا۔ برج بنائے، خندق کھودیں، رسد ہم پہنچائی اور رشیدی حکومت  
کے زمانہ میں جو آلات حرب زمین میں دفن تھے انہیں نکال لیا۔ ابن سعود  
اب حملہ کی مداخلت کے لیے تھوڑا بہت تیار تھا۔ اس اثنا میں اس نے  
ایک فوجی دستہ بھی تیار کر لیا۔

ان باتوں کی اطلاع جب رشید کو ملی تو وہ بہت برہم ہوا اور  
کہنے لگا ”یہ غیب بے وقوف، یہ تو ایک پرندہ ہے جو جال میں پھنس گیا۔“  
اس وقت رشید دوسرے اہم کاموں میں مصروف تھا۔ اس کی  
نظروں میں اس کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ کام سے فارغ ہو کر وہ اس  
کی خبر لینا چاہتا تھا۔

ابن سعود گونپولین کی طرح جنگی چالوں سے واقف نہ تھا۔  
تاہم اس میں فوجی ذکاوت بدرجہ اتم موجود تھی۔ وہ جانتا تھا کہ رشیدیوں  
کی اتنی بڑی فوج کے مقابلہ میں اس طرح قلعہ بند رہنا قرین مصلحت  
نہیں تا وقتیکہ باہر نکل کر کچھ پھیل نہ کی جائے مقابلہ یا کامیابی خام خیالی  
ہے۔ اس نے فوراً اپنے والد کو ریاض کی فتح کی اطلاع بھیجی اور ریاض

آنے کی درخواست کی کیونکہ ریاض کی مافت کے لیے وہ اپنے باپ سے زیادہ کسی پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔

عبدالرحمن اپنے دوسرے لڑکے عبداللہ کو ساتھ لے کر کویت سے نکلا اور احسا، سے جوتے ہوئے ریاض کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں اس نے ممکنہ حفاظتی تدابیر کے ساتھ اپنے سفر کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی۔ بالآخر چھپتے چھپاتے ریگستان دہنہ کے غیر آباد علاقوں سے ہوتا ہوا وہ بصد ہزار مشکل خیر و عافیت سے ریاض پہنچا۔

ریاض کے باشندوں نے عبدالرحمن کا پرجوش خیر مقدم کیا اور اسے اپنا حاکم تسلیم کیا۔ تھوڑے دن بعد عبدالرحمن نے ریاض کے علماء اور شرفاء کو جمع کر کے ابن سعود کو اپنا جانشین قرار دیا اور سعود و عظم کی تلوار دی جو پشت و پشت سے باپ سے بیٹے کو ورثہ چلی آرہی تھی۔ یہ تلوار بڑی نفیس اور عمدہ ہے اس کا پمٹرا دمشق فولاد اور قبضہ سونے کا ہے، نیام پر چاندی کا کام ہے۔

ابتداء ہی سے عبدالرحمن باعلیٰ جنگجو اور بہادر تھا۔ باوجود بڑھاپے کے اس میں اب بھی وہی پہلے کی سی آن بان تھی لیکن اب اس پر مذہبیت کا رنگ بہت غالب آچکا تھا۔ زیادہ تر وقت قرآن اور حدیث کے مطالعہ میں صرف کرتا اور اکثر اذکار و اشغال میں مصروف رہتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو ہر وقت نصیحت کرتا اور انہیں مفید شوق دیا کرتا تھا۔ لیکن مہات میں ان کی رہبری سے مجبور تھا۔ کیونکہ یہ عمر

جنگِ جدال کے لیے موزوں نہ تھی۔

ابن سعود باپ کا حد سے زیادہ احترام کرتا اس کی نصیحتوں کو کان لگا کر سنتا اور ضرورت کے وقت ان پر عمل کرتا تھا،

(۲)

ریاض پر اب ابن سعود کی حکومت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ بہت جلد نجد پر اور پھر سارے عرب پر قبضہ کر لے۔ اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اس نے مدافعت کے لیے انتظامات شروع کر دیے اور جب اس امر کا اطمینان ہو گیا کہ فہر میں بیرونی حملوں کو روکنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے تب مدافعت کے سارے انتظامات اس نے اپنے باپ اور بھائیوں کے ذمہ کر دیے اور خود منتخبہ فوج لے کر سو اونٹ اور چالیس گھوڑوں کے ساتھ اپنے بھائی سعد کے ہمراہ باہر نکلا۔ سعد، ابن سعود کا سب سے زیادہ چیتا بھائی تھا، اس کی جسمانی بناوٹ اور خیالات ابن سعود سے ملتے جلتے تھے ان دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ البتہ سعد میں قوتِ فیصلہ اور خود ضبطی کی کمی تھی۔

ریاض کو مرکز قرار دیکر وہ نجد کے جنوب میں افسلاج اور حارج کے علاقوں میں پہنچا، کہ یہاں سے امداد لے۔ یہاں کے شیوخ قبیلہ اسر سے تھے جو اس کی ماں کے رشتہ دار ہوتے تھے، لہذا وہ اس کا ساتھ دیتے۔ اس کے علاوہ ابن سعود کی نظر ان لوگوں پر اس لیے بھی پڑی کہ یہ لوگ دلیر، بہادر اور رشیدیوں کے جانی دشمن تھے۔ اس کے مقصد کیلئے

یہ لوگ حد درجہ موزوں تھے۔

رشیدیوں کے سپاہی اس کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ لیکن اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔ ابن سعود اب بڑی بہت اور تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اگر کوئی قبیلہ اس کے خلاف سر اٹھاتا تو فوراً اسے وہ کوئی موقع تلاش کر کے ایسے وقت میں ان پر حملہ کرنا جب کہ وہ اس کے لیے تیار نہ ہوں۔ ہمیشہ اسے کامیابی ہوتی گئی، جس سے فوجیوں کے دل پر اس کا گہرا اثر ہوا اور وہ اس سے ڈرنے لگے۔ دن بدن اس کی بہادری افسانہ بنتی گئی۔ چھ آدمیوں سے ریاض پر قبضہ حاصل کرنا بظاہر افسانہ نہیں تو پھر کیا ہے؟ عرب کے اطراف و اکناف میں اس کی بہادری کا چرچا ہونے لگا اور اس کی شخصیت مسلم ہوتی گئی۔ تلوار کی لڑائی تو اس کے نزدیک بچوں کا کھیل تھا۔ فاصلے بھی وہ اسی سرعت کیساتھ کرتا اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک ہی وقت میں وہ دو مقاموں پر موجود ہے۔

ابن سعود کے متعلق رشید کا خیال غلط ثابت ہوا۔ وہ اسے ایک معمولی آدمی سمجھتا تھا اور ریاض کے واقعہ کو محض اتفاق پر محمول کرتا تھا۔ لیکن جب اس کی بہادری کی مزید خبریں اس کے کان تک پہنچیں تو وہ چونک پڑا اور اس کو ختم کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ رشید بذات خود بہت بہادر سپاہی تھا۔ البتہ اس میں حکومت کا مادہ کم تھا۔ بہر حال شمري قبائل کو ساتھ لیکر وہ ریاض کی طرف روانہ ہوا اور جب قریب پہنچا تو

اطلاع ملی کہ شہر اس وقت اچھی طرح سے محفوظ و محصور ہے، اس کے مشیروں نے صلاح دی کہ اطراف کی باؤلیوں پر قبضہ کر کے پانی کی رسد بند کر دی جائے لیکن رشید محاصرہ کا موافق نہ تھا، وہ فوری حملہ کر کے لوگوں کے دلوں پر اپنی بہاؤ کی کاسکہ جمانا چاہتا تھا اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ابن سعود جنوب کی طرف روانہ ہوا تو اس نے بھی جنوب ہی کا رخ کیا۔

ابن سعود جنوب میں بہت دور نکل چکا تھا۔ اس اثنا ہی وہ مختلف قبائل کے شیوخ سے ملا۔ ان سے اتحاد و دوستی کی درخواست کی، بعضوں نے ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور اکثر و بیشتر قبائل نے شہری جنگجوؤں کے خوف سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن ابن سعود آہستہ آہستہ ان کے دلوں سے خوف دور کرتا گیا اور ان کے جوش کی آگ کو بجھانے لگا۔ وہ اب اپنے مقصد کے پیچھے ہمہ تن منہمک تھا، بہت کم سوتا اور بہت کم کھاتا تھا۔ اس کا دیا وہ وقت اہل قبائل اور شیوخ سے ملنے، ان سے مباحثہ کرنے اور انہیں سمجھانے منانے میں گزرتا تھا۔ یہ بڑا صبر آزما کام تھا۔ لیکن ابن سعود کا یہ مستحکم ارادہ اللہ متقل مزاجی ہی تھی کہ وہ اس سے بیزا نہیں آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے اندر اس کے پاس ایک ہزار آدمیوں کی ایک فوج تیار ہو گئی۔ اب وہ حوطہ میں تھا کہ ایک دن دوپہر کے وقت ایک تیز رو سوار نے آکر اطلاع دی کہ رشید نجران میں ہے اور اللہ لم پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔

اب وقت ضائع کرنا فضول تھا، حوطہ سے الدم، میل پر تھا، ابن سعود چاہتا تھا کہ اپنی فوج کے ساتھ صبح ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جائے۔ اس کے لیے یہ غیر ممکن نہ تھا، وہ تو اس سے بھی جلد پہنچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ لیکن اگر یہ سیدھا نعبان کا رخ کرتا تو ممکن تھا کہ جاسوس رشیدی فوج کو اطلاع دیدیتے اس لیے اس نے انہیں مخالطہ دینے کے لیے اعلان کر دیا کہ وہ مغرب کی طرف کوچ کر رہا ہے، اس کے بعد وہ مغرب کی طرف تھوڑی دور گیا اور پھر طویق کی پہاڑیوں سے جتنا ہوا شمال کی طرف چلا۔

ابن سعود اپنے ہمراہیوں کے ساتھ نہایت سرعت سے سفر کر رہا تھا راستہ میں اسے بڑی دشکاری ہوئی۔ سوار اور اونٹ دونوں بے دم ہو گئے تھے ایک دفعہ تو ابن سعود اونٹ سے گر کر نیچے دب گیا۔ ساتھیوں نے اسے پھرتی سے نکال لیا تاہم کافی صدمہ پہنچا لیکن وہ ایک منٹ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سخت تکلیف میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ برابر اپنے ساتھیوں کو جوش دلاتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا بالآخر دن نکلنے سے بہت پہلے وہ الدم پہنچ گیا۔ اہل الدم پہلے ہی سے اس کے ساتھ ہو چکے تھے اس لیے ان بچانا ابن سعود کا فرض تھا۔ اگر وہ انہیں انداز نہ دیتا تو پھر دوسروں پر سے اس کا اعتماد اٹھ جاتا۔ بہر حال وہ وقت پر پہنچ گیا۔ شہر میں داخل ہو کر سب دروازے بند کر لے، فسیل پر آدمی پڑھوئے

اور چو طرف پہرے مقرر کرائیے۔ فہمان کے شمال میں کمجوروں کے بن میں بھی کچھ آدمی بھیج دیے۔ اس کے بعد اس میں سکت نام کو نہ رہی۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ گذشتہ سات روز سے اسے نام کو آرام نہیں ملا تھا، وہ اب بالکل بے دم تھا۔ ساتھیوں نے اسے اٹھا کر آرام سے لٹایا۔ تیل کی لاش کی اور محاف اٹھا دی۔ دوسرے دن ظہر کی نماز کے وقت جب وہ اٹھا تو اس کا سارا جسم اکڑا ہوا تھا۔ لیکن اب اس میں کسی قدر تازگی آگئی تھی۔

(۳)

اسی دن رشید نے اپنی خاص فوج کا ایک دستہ دلام چکر کرنے کے لیے روانہ کیا۔ جیسے ہی یہ دستہ کمجوروں کے درختوں کے قریب پہنچا ابن سمود کے سپاہیوں نے گولیاں چلائی شروع کر دیں۔ چھ آدمی اور چار گھوڑے مارے گئے۔ یہ حال دیکھ کر دستہ کے دوسرے سپاہی واپس لوٹے۔ رشید نے اور آدمی روانہ کیے، وہ سمجھ گیا کہ کوئی بڑی فوج اس کے مقابل ہے لیکن اس کا صحیح اندازہ اسے نہ ہو سکا کیونکہ ابن سمود نے اپنے سپاہی کمجوروں کے درختوں میں منتشر کر دیے تھے۔ اور شہر میں تو کافی آدمی موجود تھے۔

ابن سمود جب دو پہر کے کھانے کے لیے بیٹھا تو اسے نعرہ جنگ سنائی دیا۔ رشید اپنی فوج کے ساتھ شہر کی طرف آ رہا تھا۔ وسط میں پیادہ فوج تھی اور اطراف میں سوار تھے۔ سب کے ہاتھوں میں



برہنہ تلواریں تھیں اور سب رشیدی جھنڈے کے سایہ میں جنگ کے  
فرے لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

ابن سعود کے استقلال میں ذرا بھی لغزش نہیں آئی۔ وہ اطمینان سے  
خاموش بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ہر اہی جنگ کے لیے تھے ہوئے لیکن اس نے  
انہیں عجلت سے روکا اور جب دشمن کی فوج بہت قریب پہنچی تو اس نے گلی  
چلانے کا حکم دیا۔ فوج کے پاؤں میدان سے اکھڑ گئے۔ رشیدیوں نے کبھی بھی  
ابن سعود کی طرف سے اس قسم کی باقاعدہ اور منظمہ مافعت کی توقع نہیں  
کی تھی۔ اتنے میں ابن سعود نعرہ جنگ بلند کرتا ہوا دشمن کی فوج پر جمپٹا۔  
فوجی بھاگنے لگے۔ ابن سعود نے ان کا تعاقب کیا اور رشید پوری طرح  
سے شکست کھا کر ریاض کی طرف بھاگ گیا۔

یہ خبر بجلی کی طرح سارے نجد میں پھیل گئی۔ برابر ایک صدی سے  
سعودی رشیدیوں کے مقابلہ میں لپٹا ہو رہے تھے۔ لیکن بالآخر سعودیوں نے  
رشیدیوں کو نیچا دکھایا۔ حارج اور اسلاج کے لوگ اس کے ساتھ ہو گئے  
اور نجد کے جنوبی علاقہ نے اس کا ساتھ دیا۔

رشید نے اس جنگ میں شکست تو کھائی مگر وہ ایسا کم ہمت  
نہ تھا جو خاموش رہ جاتا۔ اس کی بلند وصلگی اور عزت پر یہ ایک برا وقت  
تھا۔ اس نے سوچا کہ اب تاخیر نقصان دہ ہے۔ اگر ذری سہی بھی  
غفلت ہوئی تو ابن سعود کی قوت بڑھ جائیگی۔ اس لیے حال پہنچتے ہی  
اس نے ایک نئی فوج جمع کر کے کویت کا رخ کیا۔ مبارک نے ابن سعود کو

اعداد کے لیے طلب کیا اور وہ فوراً کویت کی طرف روانہ ہوا۔ رشید بھی یہی چاہتا تھا۔ جیسے ہی اسے اطلاع ملی کہ وہ اس کے مقابلہ کے لیے کویت کی طرف آیا ہے، خود کویت کو چھوڑ کر ریاض کی طرف چل نکلا تاکہ ابن سعود کی عدم موجودگی میں ریاض پر قبضہ کر لے۔ لیکن یہاں عبدالرحمن ہر طرح سے تیار بیٹھا تھا۔ اس نے باہر ہی سے رشیدیوں کو چلا دیا۔ جیسے ہی ابن سعود کو یہ اطلاع ملی کہ رشیدی ریاض کی طرف گئے ہیں تو خود اس نے ریاض کا رخ نہیں کیا بلکہ مغرب کی طرف روانہ ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ریاض پر انہیں شکست ہوگی اور جب وہ وہاں سے بھاگیں گے تو ٹھیک اسی طرف کو نکل آئیں گے۔ اور ہوا یہی۔ ریاض سے رشیدی اسی راستہ توڑے۔ شمری اب بہت تنگ گئے تھے، بال بچوں کی یاد انہیں بہت تازہ اور مسلسل شکستوں نے ان کی ہمت کو بہت پست کر دیا تھا۔ وہ کھم گئے اور اپنے گھروں کو جانے لگے۔ اس طرح رشیدی فوج کا خاتمہ ہو گیا۔

ابن سعود کے لیے یہ بہت بہتر موقع تھا۔ اس نے اس سے فائدہ اٹھایا اور رشیدیوں کو بھاگا کر اطراف و اکناف کے گاؤں پر قبضہ کر لیا۔ اب نجد کے شمال میں ابن سعود کی ۵۰ میل تک حکومت تھی۔

— (۴) —

ان کامیابیوں سے ابن سعود کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ ایک بہادر سپاہی کی حیثیت سے اس کا نام سارے عرب میں مشہور ہو گیا۔ اور دُور دُور کے قبائل اس سے آکر ملنے لگے۔ وہ اب نجد کے نقشہ بنا

نصف حصہ پر قابض تھا۔ اور رشید کے مقابلہ کے لیے اس کے پاس کافی وسائل مہیا ہو گئے تھے۔ سلاطین اور سلاطین کے ابتدائی زمانہ تک کچھ نہ کچھ لڑائی ہوتی رہی لیکن اس کے بعد قحط پڑ گیا جس کی وجہ سے جانہین نے کچھ دنوں کے لیے سکوت اختیار کیا۔

اب رشید اور ابن سعود کی شخصیتوں کا مقابلہ تھا۔ رشید کے قدم تو پیسے ہی سے چمے ہوئے تھے لیکن ابن سعود کے پاس بھی اب کافی قوت جمع ہو گئی تھی لیکن دونوں کو بھی کامل اطمینان نصیب نہ تھا کیونکہ قبائل کی حالت کچھ عجیب ناگفتہ بہ تھی۔ آج ایک کا ساتھ دیا اور کل دوسروں کے ہو گئے۔ ایک نے لالچ دیا اس کے دوست بن گئے اور پھر کل ذی اسے شکست ہوئی، انجان ہو گئے بلکہ موقع ملے تو خود اسی پر حملہ کر بیٹھے۔ بالخصوص عجمانیوں کی دعا باز فطرت ناقابل اعتماد تھی۔ اور جانہین کو ان کے خدشہ لگا ہوا تھا۔ ایسی صورت میں کسی کو کیسے اطمینان حاصل ہو سکتا؟ پھر اب سوال دو شخصیتوں کا تھا اور حالات کا اطمینان بخش ہونا انہی کے فیصلہ پر منحصر تھا۔

رشید پستہ قد، سیاہ فام، درمچھورا سا آدمی تھا۔ کنجوس اور ترس خیز بھی تھا۔ قبائل پر حکومت کرنے کی اس میں بہت کم صلاحیت موجود تھی۔ وہ لوٹ باؤ کر کے دولت حاصل کرنے کا خواہاں تھا۔ اس کی کامیابی اور ناکامی کا دار و مدار بالکل اس کی فوج پر تھا۔ اگر فوج میں بدولی پیدا ہو جائے تو اس کو سنبھالنے سے وہ مجبور تھا۔

برخلاف اس کے ابن سعود فیاض دل اور مستعل مزاج انسان تھا۔ اس میں صبر کا کافی مادہ تھا۔ قبائل کو سنبھالنے کی بھی اس میں کافی محنت موجود تھی۔ وہ ان کی غلطیوں کو نظر انداز کر کے انہیں بڑے بڑے کاموں کے لیے اکساتا تھا۔ اس میں فیاضی، شجاعت اور راست بازی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، یہ خصوصیات عربوں کی پسندیدہ تھیں۔ ابن سعود گو وہابی تھا لیکن وہابیوں کی طرح خشک مزاج نہیں۔ وہ اکثر نستا، روتا بھی تھا۔ یہ جوان اور مذہبی آدمی تھا، برخلاف اس کے رشید اب بڑا صا ہو چلا تھا۔ ابن سعود، تباہی اور بربادی کے لیے نہیں بلکہ حکومت اور اقتدار کے لیے لڑنا چاہتا تھا اور رعایا کے دلوں کو تکلیف پہنچانا گناہ سمجھتا تھا۔ یہ خصوصیات اس کی زندگی کو کامیاب بنانے میں مفید ثابت ہوئیں۔

۱۹۳۱ء میں بارش ہوئی اور قحط دور ہو گیا تو ابن سعود شمال کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے اور شمر کے درمیان قدیم نجد کا مالدار شہر قصیم واقع تھا۔ غزیرہ اور بریدہ اس کے مخصوص علاقے تھے۔ ان پر گو رشیدیوں کی حکومت تھی تاہم یہاں کے باشندے ابن سعود کے حامی اور طرفدار تھے۔

ابن سعود بہت جلد قصیم پہنچ گیا۔ یہاں کچھ ایسی زیادہ وقت نہیں نہیں آئی، پہلے ہی سے اہل تعلیم اس کے موافق اور رشید کے دشمن سمجھے تھے۔ اس نے بہت آسانی سے وہاں کے حاکم حسین جرّاد کو قتل کر کے غزیرہ پر قبضہ کیا اور پھر شہر بریدہ کا محاصرہ کر لیا۔ رشید نے بریدہ کی

فوج کی رہائی کے لیے اپنے چھیرے بھائی عبیدہ کی سرکردگی میں فوج روانہ کی۔ ابن سعود نے فوراً اس فوج پر حملہ کر دیا، سخت لڑائی کے بعد رشیدیوں کو شکست ہوئی شہری قبائل منتشر ہو کر اپنے اپنے گھروں کو بھاگ گئے اور عبیدہ گرفتار کر لیا گیا۔

جب عبیدہ ابن سعود کے سامنے لایا گیا تو وہ اپنے عرب گھوڑے پر سوار تھا، پوچھنے لگا۔

”اچھا یہ عبیدہ ابن رشید ہے، لیکن کس نے میرے چچا محمد کو ریاض میں قتل کیا تھا؟“

یہ کہہ کر ابن سعود گھوڑے پر سے اتر پڑا اور والد کی دی ہوئی تلوار کو میان سے باہر نکال کر قتل کرنے لگا۔

عبیدہ نے کہا ”اے ابو ترکی، مجھے قتل نہ کر۔“

ابن سعود نے جواب دیا ”یہ رحم کا مقام نہیں ہے، میں انصاف چاہتا ہوں، قتل کا انتقام۔“

یہ کہہ کر اس نے عبیدہ پر اپنی تلوار سے تین ہاتھ مارے۔ فوارے کی طرح جسم سے خون اڑنے لگا، عبیدہ کا دل باہر نکل آیا اور زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ ابن سعود نے اپنی تلوار کو بوسہ دیا۔ پھر ٹکڑے کو صاف کیا اور اسے میلان میں رکھ لیا۔

جب بریدہ کی فوج کو رہائی کی اب کوئی امید باقی نہ رہی تو اس نے ابن سعود کے آگے سر تسلیم خم کر دیا، شمر تک کا تمام علاقہ ابن سعود کے

---

قبضہ میں آگیا۔ رشید نجد سے باہر نکال دیا گیا اور پھر سے ایک مرتبہ  
سارا نجد سعودیوں کے قبضہ میں آگیا۔

اس درخشاں کامیابی کے بعد جب وہ ریاض واپس ہوا تو اکثر کٹے  
وہابی تک اس سے ملنے اور مبارکباد دینے کے لیے آئے۔ بڑے بزرگوں  
مذہبی پیشواؤں، حاکموں اور مختلف قبائل کے شیوخ کی خواہش کے  
مطابق سب بگ ریاض بھی جامع مسجد میں جمع ہوئے اور ظہر کی نماز کے بعد  
عبدالرحمن نے ابن سعود کو

نجد کا امیر اور وہابیوں کا امام

قرار دیا۔

# پانچواں باب

## رشید کا انجام

————— ( ۱ ) —————

ابن سعود کی اس مہتمم با شان کا میابی نے نہ صرف عرب کے ریگستان میں ایک تہلکہ مچا دیا بلکہ ترک بھی اس سے چونک پڑے۔ وہ عرب کے برائے نام حاکم تھے، ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے لڑانا اور ہمیشہ کمزور کی تائید کر کے زوردار کی قوت گھٹانی، ایک عرصہ سے ان کی کامیاب پالیسی رہی تھی۔ جس وقت رشید زور پکڑا رہا تھا، انہوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور اب وہ ابن سعود کے خلاف کارروائی کرنے لگے۔

سلطان عبدالحمید خاں کی خواہش تھی کہ پھر سے دولت عثمانی کا احیاء ہو اور وہ پہلے کی طرح سلطان اعظم اور

خلیفہ بن کرد وسط عرب پر حکومت کریں۔ جرمن مومع کے منتظر تھے، سلطان کے اس رجحان کو دیکھ کر انہوں نے اپنے مقصد کی تحت انہیں اکسایا، مشرق کی طرف بغداد و ریلوے کا پایہ ڈال دیا اور خلیج فارس کی طرف اپنے آدمی اور تاجر بھیجنے لگے۔ غرض انگریزوں کو بے دخل کرنے کے لیے وہ ممکنہ تمام ہیرا اختیار کر رہے تھے، ان کے لیے ابن سعود سخت خطرناک تھا، ایک تو خود وہ اپنا ذاتی اثر رکھتا تھا اور دوسرے وہ انگریزوں کے دوست مبارک کا حلیف اور طرفدار بھی تھا۔ انہوں نے عبد الحمید خاں کو سمجھایا کہ وہ رشید کو ہموار کریں، رشید کی قوت گھٹ رہی تھی، اس نے سلطان کی امداد کو خوشی سے قبول کیا۔ سلطان نے یمن اور حجاز میں مزید فوج روانہ کی اور بغداد اور احسا میں اپنی قوت بڑھالی اور دمشق سے حجاز اور پھر مدینہ تک ریل کی پٹری ڈالنے کا حکم دیدیا۔

ابن سعود نے اس موقع پر بھی مداخلت نہیں کی بلکہ خاموش حالات کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس اثناء میں ابن سعود کو شکست دینے کے لیے ترکوں نے اور فوج بھیجی، رشید نے سلاطین میں گراما کے ابتدائی زمانہ میں ترکی فوج کے ساتھ نجد کا رخ کیا، عنیزہ اور بریدہ والوں کو دھکیا دیں اور انہیں ابن سعود کی مخالفت کے لیے مجبور کیا۔ ابن سعود بھی اپنے آدمی جمع کر کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گیا اور تنجائیہ میں ڈیرہ ڈال دیا۔ رشید کے پاس فوج اور دولت کی کمی نہ تھی۔



ابن سعود مقابلہ مفلس و نادار تھا حتیٰ کہ اس کے پاس کھانے پینے کا انتظام تک نہ تھا۔ چنانچہ بخاریہ میں اس رات فوج نے عملاً فاقہ کیا۔ اس کے ساتھی پست بہت ہو گئے لیکن ابن سعود نے انہیں دم دلاسا دیا اور کامرانی کا دل خوش کن خواب دکھا کر انہیں جنگ کے لیے آمادہ کر لیا۔

شام کے وقت ابن سعود کے سامنے سے کچھ دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے دشمن کی فوج کا گمان ہوا اور اب وہ مافعت کیلئے تیار ہونے کو تھا کہ جاسوسوں نے اگر اطلاع دی کہ یہ دشمن کی فوج نہیں ہے بلکہ چند ملازم ترکی فوج کے لیے بکرے چرا کر لیجا رہے ہیں۔ یہ سنکر ابن سعود نے فوراً ان کا تعاقب کیا اور ان پر حملہ کر کے ان آدمیوں سے بکرے چھین لیے۔ یہ دیکھکر رشیدی ابن سعود کی طرف بڑھے، دونوں کا زوردار مقابلہ ہوا۔ لیکن اتنے میں رات ہو گئی جس کی باعث دونوں فوجیں اپنے اپنے خیموں کو واپس چلی گئیں۔ آج رات ابن سعود کے ڈیرے میں جشن تھا۔ ایک دن کے فاقہ کے بعد غذا اور پھر گوشت جیسی ”سید الطعام“ غذا نعمت بالائے نعمت تھی! دوسرے دن صبح ہونے سے قبل ہی ابن سعود نے رشیدیوں پر حملہ کر دیا، شمری فوج ہتھیار چھوڑ بیٹھنے لگی۔ لیکن ترکی فوج وسط میں ستون کی طرح کھڑی ہوئی شمری قبائل کی بہت افزائی کر رہی تھی لیکن باوجود اس کے ابن سعود کے حملے مسلسل کامیاب

رہے، یہ حال دیکھ کر ترکی فوج نے دن ڈھکنے کے بعد گولہ باری شروع کر دی۔ عربوں نے ایسا دمہشت انگیز منظر پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، ان کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ بدحواس ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ابن سعود یہ رنگ دیکھ کر خود گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے آگیا۔ اور پر جوش الفاظ میں اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھانے لگا۔ ایک گولہ بالکل اس کے بازو سے گذر گیا۔ ایک ٹکڑا اس کی انگلی کو لگا اور آدھی انگلی بالکل غائب ہو گئی اور ایک ٹکڑا اس کے گھٹنے کو لگا جس سے بڑی طرح وہ زخمی ہوا اور جسم سے خون سسل بہنے لگا۔ ابن سعود نے اس درد کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور اسی جوش میں نعرہ لگا لگا کر اپنے لوگوں کو جمع کرنے لگا۔ اور جب سب لوگ جمع ہو گئے تو واپس لوٹ گیا۔ اس اثناء میں رشید کے ایک ہزار آدمی مارے گئے، ترک چاہتے تو قصیم اور نجد کے شمالی علاقہ پر قبضہ کر لیتے لیکن دھوپ اس شدت کی تھی کہ وہ اس کی تاب نہ لاسکے اور اس خود کو اپنے حال پر چھوڑ کر اپنے خیموں کو سدھارے۔

ابن سعود کا جسم زخموں سے چورتھا، دوسرا کوئی ہوتا تو ہفتوں بستر سے اٹھنے کا نام نہ لیتا۔ مگر آفریں ابن سعود پر کہ انتہائی درد و تکلیف کے باوجود سب کے ساتھ بیٹھا ہوا ہنس رہا تھا، درد کا نام کو بھی احساس نہ تھا۔ بلکہ کچھ آرام لینے کی بجائے اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔ عتبہ، دواسر اور اس سے بھی آگے غزوہ قبائل کے پاس

اس نے قاصد بھیجے شیوخ کو رام کرنا آسان کام نہ تھا۔ وہ اس طرح آسانی سے راضی ہونے والے نہ تھے۔ بہر حال ابن سعود نے انہیں سمجھایا کہ ترک رشیدیوں کو امداد دے رہے ہیں، جرمن ان کی پشت پناہی میں امداد اگر رشیدیوں کو فتح ہو گئی تو سمجھ لو کہ عرب کی آزادی کا خاتمہ ہے۔ بہر حال تھوڑی بہت قوت جمع کر کے ابن سعود نے رشیدیوں پر حملہ کر دیا۔ ترکی فوج ان کو بچاتی رہی۔ سعودی برابر حملہ کر رہے تھے لیکن کچھ دیر بعد قبائل مطیر نے جواب دیدیا۔ ابن سعود نے سوچا کہ اگر اب کی دفعہ شکست ہوئی تو بس خاتمہ ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ اپنے محافظ دستہ اور دوسرے سپاہیوں کے ساتھ اپنی بہن نوری کے نام کا غرہ لگاتا ہوا ترکی فوج کی طرف لپکا اور اس زور کا حملہ کیا کہ ترکی فوج کے پیر میدان سے اکھڑ گئے۔ یہ حال دیکھ کر شمریوں کے دل بھی چھوٹ گئے لیکن ترک پھر سے ایک جگہ جمع ہو گئے مگر ابن سعود کے آدمیوں نے چوٹوں سے انہیں گھیر لیا۔ اب ترکی فوج دہشت ہی منتشر ہو کر بھاگنے لگی۔ ان کے پیر لڑکھڑانے لگے، اکثر توراہت ہی میں گر گئے۔ بدوی عورتوں نے متعدد ترکی سپاہیوں کے سر تار لیے ان کا مال اسباب لوٹ لیا۔ اور چونچ رہے وہ انماں و خیزاں بعد ہزار شکل بصرہ پہنچے۔

(۲) —————  
اس شکست سے ترکوں کے وقار کو سخت دھکا پہنچا۔ وہ کبھی

خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔ بدلہ لینا ان کے لیے ناگزیر تھا۔ انہوں نے دریائے فرات کے کنارے ایک زبردست فوج جمع کر لی تاکہ ابن سحر کی فوج پر حملہ کر کے اس کا قلع قمع کر دے۔

سعودی ترکوں کی شاندار پسپائی اور اپنی درختاں کامیابی پر پٹھوں نہیں سمارہے تھے۔ وہابی ملا اور ابن سعود کے مشیر خوشی کے مارے آپے سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔ ترکی فوج کو شکست دینا واقعی ایک یادگار کارنامہ تھا! لیکن ابن سعود پر اس نسخہ کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ وہ حالات کا سرسری نہیں بلکہ گہری نظر سے مطالعہ کرتا تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ فتح، حقیقی معنی میں فتح نہیں ہے۔ کیونکہ ترکوں کی ایک تھوڑی سی فوج کو شکست دینے سے کیا حاصل؟ اگر ترک اپنی زبردست فوج بھیج دیں تو کیا مقابلہ کیا جاسکیگا؟ اب وہ مدافعت کی تدبیریں کرنے لگا۔ اسے صلح ہی میں خیر نظر آئی۔ مبارک کے ذریعہ اس نے بصرہ کے گورنر مخلص پاشا کے پاس مصالحت کی تجویز پیش کی، عبدالرحمن نے اس کی طرف سے نمایندگی کی اور یہ طے پایا کہ ترک ابن سعود کو نجد کا حاکم تصور کریں گے اور شہر قصیم پر بھی اس کا قبضہ رہیگا البتہ عنینہ اور بریدہ میں تھوڑی سی ترک فوج رہیگی۔ اس تصفیہ کے باعث ابن سعود کو ترکوں کے زبردست حملہ نجات ملی۔ معاہدہ کے مطابق ترکی فوج عنینہ اور بریدہ میں آئی۔ یہاں فوجیوں کو بڑی سخت تکلیف ہوئی۔ ایک تو گرمی دوسرے

ابلی اور غیرانوس ماحول اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ابن سعود نے ان کو کچھ بھی امداد نہ دی۔ اس کے علاوہ بصرہ سے جو کچھ بھی سامان ان کے لیے آتا وہ راستہ ہی میں کسی نہ کسی طرح سے لوٹ لیا جاتا تھا۔ اس طرح ترکی فوج ایک بڑی مشکل میں پڑ گئی۔ ”نہ پائے رفتن نہ جاے ماندن“۔ اگر وہ ذرا بھی گڑ بڑ کرتے تو عرب ان کی اچھی طرح سے خبر لے لیتے۔ چنانچہ ایک سال کے اندر اندر ترکی فوج کی حالت بڑی خراب و خستہ ہو گئی۔ کھانے کو کھانا نہیں رہا۔ اکثر دفعہ تو ان قسمت کے ماروں نے کھجور کی گٹھلیاں کھا کر اپنے پیٹ کی آگ بجھائی اور اکثروں نے مجبور ہو کر اپنے آلات حرب سستے داموں فروخت کر دیے۔ شہر قصیم کے لوگ ان کے حق میں بڑے بے رحم اور سخت دل ثابت ہوئے۔ اس لیے انھوں نے اس کا نام ”بنت الشیطان“ رکھا۔

یہ حالت دیکھ کر ترکی حکومت نے ابن سعود پر وباؤ ڈالا اور اس سے امداد کے لیے کہا۔ اس نے بھی انہیں میٹھا سا جواب دیا لیکن امداد نہ دی۔ اس پر ترک بہت بگڑے۔ ابن سعود نے امداد کے معاوضہ میں ان سے سونا طلب کیا کیونکہ قبائل کو ہموار کرنے کے لیے اسے روپیہ کی سخت ضرورت تھی۔ ترکوں نے اس سے انکار کر دیا جس پر ابن سعود بھی انجان ہو گیا۔ فی الوقت ترکوں کا اسے ذرا بھی ڈر نہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ترک اس وقت بڑی مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ حجاز اور یمن میں مسلسل بغاوتیں ہو رہی تھیں۔ شام میں انقلابی جلسے

ہو رہے تھے کہ ترکوں کو عرب سے نکال کر عرب حکومت قائم کی جائے۔  
 بھٹان، مصر، ترک اور خود مستطظیہ میں ہڑ بونگ مچی ہوئی تھی اور ترک ان  
 مخالفتوں کو روکنے میں سرگرداں و پریشان تھے۔ ابن سعود چاہتا تھا کہ  
 ایسے موقع پر اگر ترکی فوج پر حملہ کر کے اسے نکال یا ہر کر دیا جائے تو عرب  
 قبائل میں اس کا وقار بڑھ جائیگا۔ لیکن ابھی وہ اپنے خیال کو عملی جامہ  
 پہنانے کے لیے مناسب موقع کا منتظر تھا کہ خود ترکوں نے اپنی فوجیں  
 واپس بلا لیں اور احسا میں صرف چند فوجی دستے چھوڑ دیے۔ اس  
 کے بعد انہوں نے پھر کبھی وسط عرب کا رخ نہیں کیا۔

(۳)

ترک واقعی ابن سعود کے رستہ کے روڑے تھے۔ ان کے  
 چلے جانے کے بعد وہ بہت شیر ہو گیا۔ عربوں نے یہ سمجھا کہ ترک  
 ابن سعود سے ڈر کر بھاگ گئے۔ اب کیا تھا قبائل اور شیوخ اس کے  
 ساتھ تھے اور ہر ایک اتحاد و دوستی کا دم بھر رہا تھا۔ لیکن  
 ابن سعود نے دور اندیشی کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اسے اچھی  
 طرح سے معلوم تھا کہ جب تک رشید زندہ ہے، وہ کبھی عین سے بیٹھ  
 نہیں سکتا۔ عرب کی حالت بڑی عجیب تھی۔ ذری سی چوک بھی تختہ  
 آلت دینے کے لیے کافی تھی۔ بیرونی حملوں کے ساتھ ساتھ ابن  
 کو خود اپنے والوں پر بھی اعتماد نہ تھا۔ اگر اس سے ذری بھی لغزش  
 ہو جاتی تو خود اس کے ساتھی اس کو موت کے گھاٹ اتارنے میں

فری بھی تاخیر نہ کرتے۔ اسی لیے وہ ہر معاملہ میں حد درجہ محتاط تھا۔  
 محافظہ دستہ اس کے خیمہ کی حفاظت کرتا تھا۔ راتوں کو وہ بہت کم سوتا  
 تھا۔ جنگ اور سفر میں اس نے کبھی بھی اپنے ساتھ پلنگ نہیں رکھا بلکہ  
 ریت پر کپڑا بچھا کر سو رہتا تھا۔ ہمیشہ اس کے بازو برہنہ تلوار رہتی تھی۔  
 اور بعض دفعہ تو وہ تلوار پر سر ٹیک کر کھڑا کھڑا سو جاتا تھا اور جب  
 جاگتا تو ایک پل میں بیترا کاٹ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا تھا۔ اس کے  
 خیمہ میں کسی کو بلا اجازت داخلہ کی ممانعت تھی۔ ایک دفعہ اس کا  
 ملازم بلا اطلاع اندر داخل ہو گیا۔ ابن سعود سو رہا تھا۔ آہٹ پا کر  
 وہ اٹھ بیٹھا اور ابھی ملازم کی زبان سے ایک لفظ بھی برابر نہ نکلا تھا  
 کہ اس کا ہاتھ شانہ سے جدا ہو گیا۔ ابن سعود کا گھوڑا بھی ہمیشہ خیمہ  
 کے بازو بندھا رہتا تھا۔ الارم کے ساتھ وہ خیمہ کے باہر آتا اور چاچے  
 گھوڑے پر زین ہو یا نہ ہو، برہنہ تلوار ہاتھ میں لے کر اس پر سوار ہو جاتا۔ اس  
 معاملہ میں وہ بجلی سے کسی طرح کم نہ تھا۔

اس طرز زندگی نے ابن سعود کو ایک قوی پیکل انسان بنا دیا اور اس  
 ارادوں میں استقامت پیدا کر دی تھی کہ وہ اس کے پاس  
 کوئی چیز نہ تھی وہ خیمہ کے دروازہ پر بیٹھ کر گھنٹوں اہل قبائل سے ملتا  
 ان کے جھگڑے چکاتا۔ حاسوسوں کی لائی ہوئی خبروں پر غور کرتا  
 انہیں ضروری ہدایتیں دیتا اور تمام دن اور بڑی رات گئے تک  
 مسلسل کام کرتا تھا۔ ان دینی کاموں کے باوجود اس نے ارکانِ مذہب

کبھی غفلت نہ کی۔ پانچ وقت کی نماز ادا کرتا، سختی کے ساتھ روزے لکھتا اور قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا۔

رشید بھی ارادہ کا پکا تھا۔ اس نے بہت نہیں ماری۔ بلکہ اپنے لوگوں کو جمع کر کے ابن سعود پر حملہ کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ مگر اس دفعہ وہ بہت کچھ تھکا ہوا تھا۔ اور اس کے ساتھیوں کے حوصلے بھی بہت پست ہو چکے تھے۔ الغرض ان لوگوں نے موہنہ گاؤں میں قیام کیا اور چھین سے سو رہے، کیونکہ ابن سعود ان سے زیادہ فاصلہ پر تھا اور انہیں کسی حملہ کی توقع نہ تھی۔ لیکن ابن سعود کے مخبروں نے رشید کی آمد کی اطلاع دیدی اور وہ اپنی فوج لے کر برق رفتاری کے ساتھ موہنہ کی طرف روانہ ہوا اور صبح ہونے سے پیشتر ہی رشیدی فوج پر حملہ کر دیا۔ تھکی ماندی فوج وحشت سے اٹھی اور سب اسی تتر بتر ہو کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ابن سعود کے آدمی انتہائی جوش میں دشمنوں پر حملہ کر رہے تھے۔ اس دہشت آفریں منظر میں بھی رشید ہراساں نہیں ہوا بلکہ نعرہ جنگ بلند کرتا ہوا وہ اپنے ساتھیوں کی بہت بڑھارہا تھا۔ لیکن اس کی یہ جان توڑ کوشش کچھ بار آور نہیں ہوئی اور تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ ایک گولی کا نشانہ بن کر زمین پر آ رہا۔ ابن سعود نے اس کا سر کاٹ کر نیزہ پر چڑھا تمام گاؤں میں پھردایا تاکہ عوام کو رشید کی موت کا یقین ہو جائے۔ رشید کے قتل کی اطلاع آگ کی طرح عرب کی اطراف و اکناف میں پھیل گئی اور جب شہر اور محل میں یہ خبر



پہنچی تو رشید کے دشا، اقتدار کے لیے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے  
 ہو گئے اور خانہ جنگیوں کا بازار گرم ہو گیا اس کے ساتھ قبائل بھی  
 کسی نہ کسی کی طرفداری کر کے ایک دوسرے سے الجھ پڑے اور حائل کے  
 عرض و طول میں خاصی بڑھتی پھیل گئی۔

یہ صورت حال ابن سعود کے لیے امید افزا تھی !

# چھٹا باب

## سعودی فتوحات اور الاخوان کی تشکیل

( | )

ابن سعود کی عمر اس وقت ستائیس سال کی تھی۔ اس کی بہادری اور کامرانی کے ڈنکے سارے عرب میں بج رہے تھے۔ ترکوں کو بھگانا ہر کرنا، رشید کا خاتمہ کر دینا، اپنی ذاتی کوشش و قوت سے نجد کی سرزمین پر قبضہ کر لینا، ایسے کارنامے تھے جن سے ابن سعود کی شخصیت سارے عرب میں مسلم ہو گئی۔ نہ صرف یہی بلکہ یہ کارنامے عرب کی تاریخ میں زرین حروف سے لکھے جائینگے اور رہتی دنیا تک یادگار رہینگے۔

اس عظیم الشان کامیابی کے باوجود ابن سعود کو سکون قلب حاصل نہ تھا۔ وہ ہمیشہ داخلی اور خارجی معاملات میں الجھا ہوا رہتا تھا۔

عرب کے باشندے بلاشبہ اسے بہادر اور مستقل مزاج مانتے تھے تاہم ایک نئے شخص کی حکومت تسلیم کرنے کے لیے وہ بھی تیار نہ تھے ہر قبیلہ بذاتِ خود خود مختار اور آزادی کا طالب تھا۔ رشید کی موت سے وہ اس لیے خوش نہیں ہوئے کہ ابن سعود ان کا حاکم بنے گا بلکہ وہ اس بات پر شاداں تھے کہ اب ان کی لوٹ مار کے دھندوں کو کوئی روکنے والا نہیں رہا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ابن سعود رشید کی طرح سختی نہیں کرے گا۔ وہ اس سے کچھ ایسے زیادہ ڈرتے بھی نہ تھے۔ لیکن ابن سعود اس قدر منصف مزاج اور زوردار آدمی تھا کہ اس نے فوراً حکم دیدیا کہ کوئی شخص بغیر اس کی اجازت کے کسی پر حملہ کرنے یا لوٹنے کا مجاز نہیں۔ اس حکم نے قبائل کو بے چین اور باغی بنا دیا۔ یہ تو اہل قبائل کا حال تھا، خود ریاض کے علماء بھی ابن سعود سے بدظن ہو گئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ابن سعود پکا فہم سی آدمی تھا، نماز پڑھتا، روزے رکھتا، اور تمام اسلامی احکامات کی سختی سے پابندی کرتا اور کرواتا تھا۔ آوارگی اور قییش سے وہ کوسوں دور تھا۔ اس حد تک تو کسی کی بھل نہ تھی کہ اس کی ذری بھی غلطی کیڑے۔ البتہ وہابی عقائد کے خلاف وہ ہمیشہ خوش و خرم رہتا تھا، فوجیوں کو کوچ کے وقت اس نے گلے کی اجازت دے رکھی تھی۔ عنبرہ کے باشندے تب کو استعمال کرتے تھے، اس نے انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ مبارک کا اچھا دوست تھا، غیر مالک کے لوگوں سے خندہ بدینی

منا اور ان کی خاطر تو وضع کرتا تھا۔ یہ باتیں وہابی ملاؤں کو سخت ناگوار گزرتی تھیں۔ انہوں نے اسلام کو رہبانیت بنالیا تھا۔ اسی باعث ان ملاؤں نے ابن سعود پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی اور اسے تنہ کیا کہ اگر یہی حال رہیگا تو یہ قبائل کو اس کے خلاف اکسا دیں گے۔ ابن سعود ان کی تلخ باتوں سے بے حد غصہ میں آیا لیکن موقع شناسی سے کام لیکر اس موقع پر انجان ہو جانا ہی مناسب سمجھا۔

یہ تو خانگی جھگڑے تھے۔ لیکن بیرونی حالات بھی اس کے کچھ ایسے موافق نہ تھے۔ مبارک اور ابن سعود میں بدگمانی پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ جب ابن سعود منسل تھا مبارک نے اس کے مدد دی تھی۔ اب ابن سعود کا اثر اور اس کی حیثیت مبارک سے کہیں زیادہ ہو گئی تھی لیکن اب بھی مبارک پہلے کی طرح ابن سعود کو بددعا دیتا اور ہلاہون و چراغی پابندی کروانا چاہتا تھا۔ ابن سعود کو یہ برتاؤ ناگوار گذرا اور مبارک بھی اس کی ترقی کو دیکھ کر جلنے لگا۔ اس طرح دونوں کے دل ایک دوسرے سے صاف نہ تھے۔ مبارک نے اپنے اثر کو بڑھانے کے لیے ترکوں سے بل کر ایک معاہدہ کر لیا اور ترکوں نے اپنے مقصد کی تحت اس سے دوستی کا عہد کر کے اسے امداد بھی دی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ابن سعود اور مبارک میں کھلی مخالفت نہیں ہوئی بلکہ دونوں ایک دوسرے کو اب بھی اپنا دوست جتلاتے رہے۔ مگر

مبارک نے اس کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ کویت اور نجد کے درمیان قبائل مطیر آباد تھے، یہ لوگ بڑے باغی اور بد فطرت تھے۔ وہ کسی کی حکومت نہیں چاہتے بلکہ بالکل آزاد رہنے کے خواہاں تھے۔ لیکن ابن سعود اپنی حکومت کا سکہ بٹھانے کے لیے ان پر دباؤ ڈال رہا تھا جس سے وہ دلوں میں ابن سعود کے مخالف ہو گئے۔ مبارک ان کے شیخ فقیصل الدویش سے مل گیا اور رشیدی خاندان کو صلاح دی کہ وہ اپنے خانگی جھگڑے ختم کر کے مطیر کے ساتھ مل جائیں۔ اس کے بعد اس نے بریدہ کے عامل کو ابن سعود کے خلاف درغلا یا۔ اور یہ سب کارروائیاں اس نے بہت ہی راز میں کیں لیکن ابن سعود نے بھی ہر طرف اپنے آدمی لگا رکھے تھے۔ وہ ان تمام واقعات سے اچھی طرح واقف اور مخالفتوں کا جواب دینے کے لیے تیار تھا۔

بریدہ کے حاکم نے ابن سعود کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ ابن سعود پہلے ہی سے تیار تھا، بلا کسی شش و پنج کے میدان میں اتر پڑا۔ درمیان میں شمری فوج بھی دونوں میں سخت لڑائی ہوئی۔ اثنائے جنگ میں ابن سعود کا گھوڑا پھسل کر گر گیا جس سے ابن سعود کی منہلی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ لیکن اس کے باوجود شام تک وہ برابر دشمن کا مقابلہ کرتا رہا۔ فتح کسی کو بھی نہیں ہوئی۔ اور دونوں فوجیں اپنے اپنے خیموں کو واپس ہو گئیں۔ رات بھر ابن سعود درد کی تکلیف سے کراہتا رہا۔ لیکن اس حادثہ سے اس نے ہمت نہیں ہاری۔ البتہ اس کے

ساتھی کچھ پست سے ہو گئے۔ لیکن دوسرے دن انتہائی دروازہ اور تکلیف کے باوجود وہ جنگ کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور دوپہر سے پیشتر ہی دشمن کو شکست دیدی۔

اس کے بعد ابن سعود مطیر پہنچ کر وہاں ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ لوٹ شروع کی۔ گاؤں جلا دیے، شیخ الدویش کو بھگا دیا اور اہل مطیر کو اپنے کیے کی خوب سزا دی۔ پھر وہ بریدہ کے عامل کو سزا دینے کے لیے بریدہ پہنچا۔ شہر کے دروازے بند تھے اور محاصرہ کی مدافعت کا معقول انتظام تھا۔ ابن سعود نے پہلے ہی سے اپنے چند آدمی شہر کے اندر روانہ کر دیے تھے۔ جب سب لوگ صبح کی نماز کے لیے مسجد کو گئے تو ان لوگوں نے شہر کے دروازے کھول دیے اور ابن سعود اندر داخل ہو گیا۔ بریدہ کے عامل نے ابن سعود کے آگے اپنا سر جھکا دیا۔ اسے یقین تھا کہ ابن سعود بغیر قتل کیے نہیں رہیگا۔ لیکن ابن سعود نے حقارت سے اسکی طرف دیکھ کر اس کے خاندان والوں کو بلا کر سب کو ایک ساتھ نجد کے باہر ہو جانے کا حکم دیدیا۔

بریدہ بڑا خطرناک شہر تھا، اس کی فضیل نہایت مستحکم تھی۔ یہاں کے لوگ مالدار اور باغی طبیعت کے تھے۔ تجارتی مرکز ہونے کے باعث اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی اور اس لحاظ سے یہ نجد کی کنجی تھی۔ یہاں حکومت کرنے کے لیے ایک اچھے آدمی کی ضرورت تھی۔ ابن سعود کی نظر انتخاب اپنے چچیرے بھائی علوی پر پڑی۔

جلوی بن سہو کا نہ صرف رشتہ دار بلکہ بہت ہی گہرا دوست بھی تھا۔ ریاض کی فتح کے وقت وہ اس کے ہمراہ تھا۔ اس کی بہادری، مستقل مزاجی اور فرعن شناسی کا سکہ عربوں کے دل پر اچھی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اسے ضبط کا بڑا خیال تھا اور قانون کی پابندی میں وہ اپنے پرے کسی کا لٹیٹ نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ بریدہ کے عامل کی حیثیت سے اس نے اپنے فرائض اس عمدگی سے انجام دیے کہ شمالی نجد کے باشندے لوٹ مار اور فساد کا نام تک بھول گئے۔

(۲)

بریدہ کے انتظامات مکمل کرنے کے بعد ابن سعود ریاض پہنچا۔ یہاں آنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ گزشتہ سال ”انجن اتحاد و ترقی“ کے باغی نوجوان جنھوں نے سلطان عبد الحمید خاں کو مغرول کر دیا تھا اب مغرول سلطان کی طرح اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے آرزو مند تھے اور اس سلسلہ میں چاہتے تھے کہ عرب کے مالدار شہروں، حجاز، مکہ، مدینہ، عسیر، یرقبنہ جائیں۔

اس مقصد کی تحت انہوں نے بہت جلد دمشق سے مدینہ تک ریل کی پٹری ڈالنے کا ارادہ کیا تاکہ پارسیوں اور زائرین کو لانے لیجانے میں سہولت ہو۔ انہوں نے حسین بن علی کو کہ کا شریف اور حجاز کا گورنر مقرر کیا۔ یہ شخص کئی امتیازی خصوصیات کا مالک تھا۔ اس نے کئی ملکی خدمات انجام دیے تھے اور عرصہ تک سلطنت کا مشیر بھی رہا تھا۔ ذاتی وجاہت بہت

اچھی تھی، عمر چاس سے اونچی، ڈاڑھی چھوٹی مگر خوبصورت، بات نہایت آہستہ کرتا اور دوران گفتگو میں خاص خاص جملے اور محاورے استعمال کرتا تھا۔ تاکہ سامعین پر رعب پڑ سکے۔ حسین کا تعلق خاندان بنی ہاشم سے تھا۔ اسی لیے ترکوں نے حجاز کی گورنری کے لیے اسے بھیجا، اور انہیں اس پر کافی اعتماد بھی تھا۔

نجد اور حجاز کے درمیان ایک وسیع میدان ہے جہاں قبیلہ عقیبہ کے لوگ اپنے اونٹ اور بکریاں چرایا کرتے تھے، یہ میدان ایک حیثیت سے خاص اہمیت رکھتا تھا کیونکہ نجد سے جو قافلے حجاز و مکہ کی طرف جاتے انہیں اسی میدان سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ اس طرح سے یہ گویا حجاز کی گنجی تھی۔ حسین سے اپنے قبضہ میں رکھنا چاہتا تھا اور ابن سعود کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ اس پر حسین اور ابن سعود دونوں میں تن گئی۔ ابن سعود قبائل عقیبہ سے ٹیکس طلب کرتا تھا اور حسین نے اپنا علاقہ جتلاتا تھا۔ ابن سعود نے مشرق کی طرف سے عقیبہ پہنچ کر وہاں کے باشندوں سے اپنی اطاعت منوالی، حسین نے ابن سعود کی تنبیہ اور اس کو وہاں سے بے دخل کرنے کے لیے اپنے لڑکے عبداللہ کو مغرب کی طرف سے بھیجا۔ ابن سعود نے بھی اپنے بھائی سعد کو روانہ کیا لیکن سعد گرفتار کر لیا گیا۔

ابن سعود کو اس بات پر غصہ آیا اور وہ حسین پر حملہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ لیکن اس اثنا میں اس پر ایک مصیبت یہ آن پڑی کہ ابن سعود



چچیرے بھائیوں نے عجمانیوں کو ابھار کر اس کے خلاف آواہ کیسا اور اہل ریاض کو دھمکی دی۔ شہر یبلی کے باشندوں نے بھی ابن سعود کے غاصبن کا ساتھ دیا۔

ابن سعود بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ اگر وہ حسین پر حملہ کر بیٹھے اور پیچھے سے عجمانی اس پر ٹوٹ پڑیں تو وہ ان دونوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے موقع کی نزاکت کو سمجھ کر اس نے حسین سے فوراً صلح کر لی اور کچھ تاوان ادا کر کے سعد کو واپس بلا لیا اور اس کے بعد تیزی سے ریاض پہنچا۔ اس وقت تک اس کے چچیرے بھائی ریاض کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ابن سعود نے ان پر بڑے زہد سے حملہ کر کے انہیں پسپا کر دیا۔ اور عجمانیوں کو احسا تک ہٹا دیا۔ بعض بھائیوں نے احسا کا رخ کیا اور چند لوگوں نے گئے جا کر حسین کے پاس پناہ لی۔

نجد کے شمال میں رہنے والوں کے لیے یہ شکست ایک طرح کا سبق تھی، ابن سعود چاہتا تھا کہ خوب کے باشندوں کو بھی اسی طرح کا ایک سبق دے کیونکہ یہ لوگ بھی اہل مطیر کی طرح اس کے ماتحت تھے لیکن اب باغی بن گئے تھے۔ اس مقصد کے لیے اس نے اس طرف اپنے لوگ روانہ کیے جنہوں نے بے رحمی کے ساتھ لوٹ لہڑ شروع کر دی اور قصبوں اور گاؤں کو آگ لگانے لگے۔ ابن سعود نے خود شہر یبلی کا رخ کیا اور وہاں پہنچ کر اہل شہر کو بڑی طرح شکست دی۔ شہر کے دروازے کے سامنے ایک بڑا چبوترہ بنوایا اور صبح کو

خود اس چوترہ پر شکن ہوا۔ اس کے سامنے شہریوں، دیہاتیوں اور  
 نزدیک و دور کے بدویوں کا ایک جم غفیر تھا، وہابی جنگجو سب انتظام  
 کر رہے تھے اور اس کا محافظ دستہ ہر کا ب تھا۔ ابن سعود اس وقت  
 ہرات کا حاکم اور مقتدر تھا۔ وہ تمام احکامات خود صادر کر رہا تھا  
 جب سب لوگ جمع ہو گئے تو اس نے شہر کے انیس سرغنوں کو بلایا،  
 وہ آئے اور چوترہ کے سامنے سب کے سب سرنگوں کھڑے ہو گئے۔  
 تب ابن سعود نے کہا

”خدا سے بڑھکر دنیا میں کوئی ہستی اوالعزم نہیں ہے۔“  
 یہ کہکر اس کے ساتھ ہی ایک اشارہ کیا اور ایک حبشی غلام  
 برہنہ تلوار لیکر پہنچا اور یکے بعد دیگرے ان سرغنوں کو قتل کرتا گیا۔  
 جب اشارہ آدمی ختم ہو چکے تو ابن سعود نے انیسویں کو معاف  
 کر دیا اور کہا۔

”جا اور جا کر لوگوں سے وہ سب کچھ کہہ دے جو تو نے دیکھا ہے۔“  
 اس قصہ کے ختم ہونے کے بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور مجمع کو  
 مخاطب کر کے گرجتی ہوئی آواز میں تقریر کرنے لگا۔ اور بغاوت کے نتیجہ پر  
 روشنی ڈالی۔ لوگ اس کی تقریر سنکر مبہوت تھے۔ مجمع پر ایک سکوت  
 کا عالم طاری تھا، ابن سعود کی گرجتی ہوئی آواز دھیمی پڑنے لگی، اس نے  
 عوام کو اپنے نزدیک بلایا اور محبت کے لہجہ میں آہستہ آہستہ بولنے لگا  
 آخر میں اس نے کہا۔

”اب تم کسی موزوں آدمی کو اپنا حاکم مقرر کر لو اور یاد رکھو کہ جب تک تم اس کے اطاعت گزار رہو گے اس کو نصیب ہوگا“ تمام دن ان اٹھارہ آدمیوں کی لاشیں کھلے میدان میں جلتی ہوئی ریت پر پڑی رہیں کہ باغی لوگ اس نظارہ سے کچھ غیرت و عبرت حاصل کر سکیں، شام کے وقت ان لاشوں کو سپرد خاک کیا گیا۔

یہی کام یہ واقعہ بھڑکتی ہوئی آگ کی طرح ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں اور ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ تک تیزی کے ساتھ پہنچ گیا۔ ابن عباس پر اس کا گہرا اثر ہوا۔ وہ کبھی توقع نہیں کرتے تھے کہ اس دور میں بھی کہیں ایسا انصاف ہو سکتا ہے! ابن سعود کا یہ فعل انصاف کا ایک نمونہ کار نامہ تھا۔ عربوں کی نظر میں اس کی وقعت بڑھ گئی اور وہ سمجھنے لگے یہی ایک ایسا بہادر، منصف مزاج اور جنگجو ہے جو ہم پر حکومت کر سکتا ہے۔

(۳)

اس واقعہ سے نجد کے اس گوشہ سے لیکر اس گوشہ تک ابن سعود کی دھماک بیٹھ گئی۔ اندرونی بغاوت دور ہو چکی، رشیدیوں کا خاتمہ ہو گیا، ترک بے دخل کیے گئے اور بنی شمر کا کوئی سردار نہ تھا۔ اس طرح اندرونی معاملات بہت بڑی حد تک سلجھ چکے تھے البتہ ابن سعود کے لیے ابھی بدویوں کو یہ سبق دینا باقی تھا کہ لوٹ مار اور دنگ فساد ان کا پیدائشی یا تو ریشی حق نہیں ہے اور وہ بھی

دوسروں کی طرح قانون کی پابندیوں سے بے نیاز نہیں بلکہ ان میں سختی کے ساتھ جکڑے ہوئے ہیں۔

(۴)

ابن سعود بہت ہی جفاکش اور منصف مزاج تھا۔ اس کے تمام کاروبار چاہے وہ ادنیٰ ہوں کہ اعلیٰ، سب عوام کی نگاہوں کے سامنے کھلے میدان میں انجام پاتے تھے۔ ریاض میں محل کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر وہ اپنی رعایا کی فریادیں سنتا اور فیصلے صادر کرتا تھا۔ دورانِ سفر میں خیمہ کے دروازہ پر بیٹھ کر قصے چکاتا اور گاؤں میں بالعموم مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر فیصلے کرتا تھا۔ ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ وہ بلا ٹکٹے اور بلا قوسط راست اس سے آکر اپنا معاملہ بیان کرے چنانچہ چشموں کے جھگڑے، نخلستانوں کے حقوق کی نزاعات، اونٹوں کی ملکیت، ڈاکہ، چوری یا مار پیٹ کے جھگڑے وہ خود چکاتا تھا۔ ذرۂ برابر بھی کسی کے ساتھ رعایت کرنا گناہ سمجھتا تھا قرآن پاک اس کا قانون تھا اور وہ ٹھیک اسی کے مطابق فیصلے کیا کرتا تھا۔ مدعی اور مدعی علیہ کے بیانات خود قلمبند کرتا۔ شہادتوں کو خود سنتا اور خود فیصلے صادر کرتا تھا اور اس کے فیصلوں کا کوئی مرافعہ نہ تھا۔

ایک دفعہ ایک بدوی نے کسی اونٹ کے بازو سے کچھ سامان اٹھا لیا۔ صاحب مال نے ابن سعود کے سامنے آکر قسم کھائی،

شہادت لی گئی۔ شہادت مکمل تھی۔ جلاؤ کو حکم ہوا کہ ہاتھ اڑا دو۔ یہ ہاتھ سارے شہر میں پھرایا گیا کہ اوروں کو عبرت حاصل ہو۔ ایک مرتبہ ایک عورت امد مرد آوارگی کے مرتکب ہوئے۔ عورت بڑی تریا چلے تھی اور مرد نے اس کے لیے کویت سے شراب منگا رکھی تھی۔ واقعات کی تصدیق کی گئی۔ اس کے بعد ابن سعود نے حکم دیا کہ عورت کو کوڑے مارتے ہوئے شہر سے باہر نکال دیا جائے اور مرد کو خوب کوڑے لگائے جائیں اور اگر وہ اس پر بھی زندہ رہے تو احسا بھیج دیا جائے۔

ایک مرتبہ دو آدمیوں میں لڑائی ہو گئی ان میں سے ایک مارا گیا۔ قاتل گرفتار ہو کر مستوجب سزا ٹھہرا۔ مقتول کے خستہ داروں نے خون بہا لینے پر رضامندی ظاہر کی۔ ابن سعود نے دیت ہی پر فیصلہ کیا۔

ایک دفعہ ایک عورت روتی ہوئی اس کے پاس آ کر شکایت کرنے لگی کہ ہمسایہ کی گائے نے اس کے باغ میں گھس کر گھانس کھالی ہے۔ ہمسایہ نے قسم کھا کر انکار کیا۔ ابن سعود نے قصاب کو بلا کر گلے کا پیٹ چروایا۔ پیٹ میں گھانس موجود تھی۔ ہمسایہ کو نقصان بھڑا پڑا اور جھوٹی قسم کے الزام میں اسے سخت جرم بھی کیا گیا۔

ابن سعود کے لیے حکومت کرنا آسان کام نہ تھا اس کیلئے

بڑی ہمت اور سلیقہ کی ضرورت تھی۔ اگر سمجھداروں سے سابقہ پڑتا تو اور بات تھی، یہاں وہ جاہلوں سے دو چار تھا، اس کے علاوہ اس کے پاس حکومت کی آڑ بھی نہ تھی جس سے اس کی اغزشیں چھپ جاتیں، وہ بذات خود حکومت تھا اور سب کی نظریں ہر دم اسی پر رہتی تھیں اگر اس معاملہ میں اس سے ذری بھی فروگزاشت ہو جاتی تو قبائل اس کے ہاتھ سے بھل جاتے، سوال یہاں صرف شخصیت کا تھا اور ابن سعود ایسی ہی الو العزم شخصیت کا مالک تھا جیسی کہ ان جہلا کے لیے ضرورت تھی اور جس کے آگے انہیں چوں و چرا کی گنجائش نہ تھی۔

(۵)

بدویوں کی سرکوبی کے لیے ابن سعود جنوب کی طرف روانہ ہونے کو تھا کہ مخبروں نے اطلاع دی کہ دولیش قبائل مطیر کو ورغلا کر اس کے خلاف آمادہ کر رہا ہے، حسین، شریف مکہ نے بھی ہوس کے جال پھیلادئے ہیں اور شامیوں نے اسے عرب کا بادشاہ بننے کا لالچ دیا ہے اور اسی طرح مبارک اور اس کے چچیرے بھائیوں کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔

یہ سب ترکوں کی کارستانی تھی۔ قبائل شمر اور مطیر اور مبارک کو ان کی طرف سے رقی اور فوجی امداد دی جا رہی تھی، حسین سے بڑے بڑے وعدے کیے جا رہے تھے، بغداد میں فوجیں جمع ہو رہی تھیں، احسا کے دارالخلافہ ہفتوف میں بھی جنگی انتظامات مکمل ہو چکے تھے غرض

ابن سعود کی مخالفت کے لیے ہر طرح کا انتظام ہو چکا تھا لیکن یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اس سے قبل بھی جبکہ ترکوں نے ابن سعود کا پیچھا اٹھایا، انہیں کچھ ایسی مجبوری ہوئی کہ فوجیں واپس بلا لینی پڑیں اور اب کی دفعہ بھی یہی ہوا۔ چنانچہ ابن سعود پر حملہ کرنے کی تیاریوں کے مکمل ہو جانے کے بعد فوراً حکومت قسطنطنیہ نے بغداد، بصرہ اور ہفوف سے اپنی فوجیں واپس بلا لیں کیونکہ اطالوی فوجوں نے ٹرٹی پولی پر حملہ کر دیا اور بلغاریوں نے جنگ کا اعلان کر دیا تھا، جس کے ماتحت ترک سخت خطرہ میں تھے۔

ابن سعود کو یہ سنہری موقعہ ہاتھ آگیا۔ کیونکہ ترک ہی اس کے لیے سخت خطرناک تھے۔ مطہر، عثمان، شمر، رشیدی اور حسین وہ سب سے نبٹ سکتا تھا، یہ کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی البتہ ترکوں کی منظم فوجوں سے مقابلہ کرنا یقیناً اس کے بس سے باہر تھا اب جبکہ ترک اپنے اندرونی معاملات میں الجھے ہوئے تھے اور عرب کی طرف ان کی قوت کمزور پڑ چکی تھی، ابن سعود نے یہی مناسب خیال کیا کہ اس زردین موقعہ سے فائدہ اٹھا کر احساء سے ترکوں کو نکال دیا جائے۔ اس مقصد کی سخت وہ اپنے منصوبے گھڑنے لگا اور صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے احساء کی طرف اپنے مخبروں کو روانہ کیا۔ مخبروں نے اطلاع دی کہ ہفوف اور دیگر ساحلی شہروں میں اب ترکی فوج بہت کم ہو گئی ہے احساء اور بالخصوص ہفوف کے باشندے ترکوں سے بہت تنگ آگئے

ہیں، امن نام کو نہیں ہے، شہر میں بچے لٹکے بھرے پڑے ہیں، بدوی جب دل چاہتا ہے لوٹ مار اور غارتگری کرتے ہیں، ان سے کوئی پرس نہیں کی جاتی، جس گھاؤں کو جی چاہے وہ لوٹ لیتے ہیں اور ہنوف میں داخل ہو کر جانور چرائے جلتے ہیں۔ یہ ترکوں کی علانیہ پھبتیاں اڑاتے ہیں قافلوں سے کافی روپیہ وصول کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود قافلوں کے منزل مقصود تک صحیح وسالم پہنچنے کا اطمینان نہ تھا حتیٰ کہ شہر سے ساحل تک کا مختصر سارستہ بھی محفوظ نہ تھا چنانچہ چند ہفتہ پہلے بدوں نے ترکوں کو مار پیٹ کر کے .. ہ اونٹ اور ان کا ساز و سامان لوٹ لیا تھا مختصر کے موتی نکالنے والے ڈاکو بن کر جہازوں کو لوٹ رہے ہیں، اس طرح بندرگاہ عمیر میں کسی جہاز کو داخل ہونے کی جرات نہ ہوتی تھی۔ اسی کے ساتھ مخبروں نے یہ بھی اطلاع دی کہ اس علاقہ کے لوگ ابن سعود کی اطاعت قبول کرنے تیار ہیں تاکہ انہیں امن و امان نصیب ہو سکے۔ ابن سعود نے سوچا کہ ایسے موقعہ پر بد معاشوں کی سرکوبی کر کے اگر علاقہ احساء اور بالخصوص شہر ہنوف کے باشندوں کی مدد کی جائے تو ان کے دلوں پر اس کا گہرا اثر ہوگا اور وہ ایک طرح سے اس کی امداد کو بہت بڑا احسان مننے لگیں گے۔ یہ خیال آتے ہی ابن سعود نے اپنی سپاہ جمع کر کے حملہ کی تیاری شروع کر دی، کھانے اور پانی کا کافی انتظام کیا، اونٹ تقسیم کر کے ایک تاریک رات میں سفر کا آغاز کر دیا اور ریگستان دہنہ سے ہوتے ہوئے احساء اور پھر سیدے ہنوف پہنچا۔



قلعہ کی تفصیل مضبوط اور کافی اونچی تھی، خندق بھی ابھی حال حال میں  
 نئی کھدی تھی، تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر برج بنے ہوئے تھے اور  
 ان پر مسلح سپاہی پہرہ دے رہے تھے قلعہ کے سامنے کھجور کے گٹنے درخت  
 تھے، ابن سعود نے اپنی فوجوں کو یہاں چھوڑ دیا اور خود سات سو سپاہیوں  
 کے ساتھ، رسیاں اور کھجور کے تنوں کی بنی ہوئی سیڑھیاں لے کر قلعہ کی  
 طرف بڑھا اور قلعہ میں داخل ہونے کے لیے ایک پست دیوار کا انتخاب  
 کیا۔ جہاں خندق بھی سوکھی ہوئی تھی۔ سپاہی سیڑھیوں کے ذریعہ  
 اوپر چڑھنے لگے۔ قلعہ کے ایک سپاہی نے ان کی کچھ آہٹ سی سنی اور  
 آواز دی، لیکن یہاں سے کچھ جواب نہ ملا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا پھر ٹپکنے لگا۔  
 تھوڑی ہی دیر میں ابن سعود سپاہیوں کے ساتھ قلعہ کے اندر داخل ہو گیا۔  
 کچھ سپاہی پہرہ والوں کی طرف لپکے اور کچھ قلعہ کے پھانک پر پہنچ کر وہاں  
 کے فوجی دستے کی خبر لینے لگے۔ یہ بیچارے اس اچانک حملہ سے کچھ  
 ایسے بدحواس ہوئے کہ الارم تک نہ دیا اور ہر ایک اپنی جان بچانے  
 کے فکر میں پڑ گیا۔

صبح ہوتے ہوتے ابن سعود کی ساری فوج قلعہ کے اندر داخل  
 ہو گئی۔ ترکی گورنر اور اس کے سپاہی مارے وحشت کے ادھر ادھر  
 بھاگنے لگے۔ اکثروں نے مسجد ابراہیم میں پناہ لی اور اندر سے دروازے  
 بند کر لیے۔ ابن سعود نے ترکی گورنر کے پاس کہلا بھیجا کہ  
 ”اگر اس طرح سے مدافعت کی جائیگی تو پھر اس کا مزہ کچھنا پڑیگا“

بہتر ہے کہ قلعہ سے باہر چلے جاؤ، معافی دے دی جائیگی“  
 گورنر نے بلاچوں وچرا اس بات کو تسلیم کر لیا اور دوسرے روز  
 اپنی فوج کے ساتھ قلعہ سے باہر نکل کر بصرہ کی طرف روانہ ہوا۔  
 اس کے بعد ابن سعود احساء میں سے گذرا۔ قبائل نے اس کی اعطائے  
 قبول کی، عجیر اور قطیف کی بندرگاہیں لے لی گئیں اور کویت کی سرحد تک  
 کا ساحلی علاقہ اس کے قبضہ میں بھی آگیا۔ ابن سعود نے اس صوبہ کا گورنر  
 جلولی کو مقرر کیا۔

تبرک مصلحتاً اس واقعہ سے ناراض نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے  
 ابن سعود کی حکومت کو تسلیم کر کے اس سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے  
 احساء، نجد کا علاقہ قرار دیا گیا اور ابن سعود نے ترکوں کی برائے نام  
 شاہنشاہیت تسلیم کی۔ اس صلہ میں ترکوں نے ابن سعود کو بہت سی  
 رقم اور ہتھیار دیے۔

(۶)

احساء کی فتح سے ابن سعود کی شہرت میں چار چاند لگ گئے، اس کے  
 حوصلے بلند اور اس کی ہمت میں وہ گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ اب بحیرہ عرب  
 کی طرف جنوبی حدود اور بحیرہ قسزم کی طرف عتیبہ تک قبضہ کرنا،  
 کویت پر حکومت اور شمر اور حائل کے علاقوں پر تسلط حاصل کرنے کا  
 آرزو مند تھا۔ لیکن اس جنگ و جدل، فتح و نصرت اور مسلسل کامرانی کے  
 چڑھتے نشہ میں اس نے اپنے باپ کی نصیحت نہیں بھولی۔ وہ محسوس

ملک کر نہیں رہے۔ آج ادھر تو کل ادھر۔ یہ محض جہالت کی وجہ تھی۔  
 تاوقتیکہ ان کو ایک رشتہ میں منسلک نہ کیا جائے کام بننا مشکل تھا۔  
 جہلم کی اس کثیر جماعت کی تنظیم اور انہیں رستہ پر لانے کے لیے  
 ابن سود نے ایک عجیب نفسیاتی ترکیب نکالی۔ اس نے سوچا اگر ان  
 سب کو کاشتکار بنادیا جائے تو پھر وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ بات تو  
 بڑی عمدہ تھی لیکن کام آسان نہ تھا۔ اس معاملہ میں اس نے مذہب سے  
 امداد یعنی مفید سمجھی، کیونکہ بدویوں کو اکسانے کے لیے مذہب ہی ایک  
 اچھا اور مفید حربہ تھا۔ اس سلسلہ میں مذہبی پیشواؤں سے اتحاد  
 کرنا اس کے لیے نہایت ضروری تھا۔ ریاض میں عبدالوہاب کے  
 خاندان کے بہت سے علماء تھے۔ ابن سود گوان کا امام تھا لیکن اپنی  
 حیثیت کو اور مستحکم کرنے کے لیے اس نے عبدالوہاب کے خاندان کی  
 ایک لڑکی سے شادی کر لی جس کے بطن سے بعد میں ایک لڑکا پیدا ہوا  
 جس کا نام فیصل رکھا گیا۔

ابن سود نے نہایت موثر انداز میں اپنی اس تحریک کو مذہبی  
 پیشواؤں کے آگے پیش کیا جس کو سب نے بالاتفاق نہ صرف تسلیم ہی کیا  
 بلکہ ہر طرح اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے آمادہ ہو گئے ابن سود  
 نے ایک ایک کو بچاس بچاس آدمیوں کا ذمہ دار قرار دیا اور اس کام کو  
 اپنے والد کے تفویض کیا۔ عبدالرحمن کی عمر گواہ بہت زیادہ ہو گئی تھی  
 تاہم اس میں ابھی بہت کچھ جہلمانی باقی تھی، وہ اکثر اہل قبائل سے

ملتا اور انہیں مختلف امور سے متعلق مشورے دیتا تھا، اس کا زیادہ تر  
 وقت عبادت، مراقبہ اور دینی کتب کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا  
 ایک بچے ویدار کی طرح اس کی حیثیت مسلم تھی اور لوگوں، بالخصوص ملاؤں  
 پر اس کا گہرا اثر تھا۔ چنانچہ ابن سعود نے جب یہ اصلاحی تحریک ان  
 لوگوں کے آگے پیش کی تھی تو سبہوں نے تحریک کی نوعیت کے لحاظ سے  
 اس کو خوش آمدید کہا لیکن دلوں میں ابن سعود کے متعلق کچھ شک  
 ہی رکھتے تھے۔ مگر جب عبدالرحمن اس معاملہ میں بیچ میں آگیا تو اب  
 کسی کو نہ تو اعتراض کی گنجائش رہی اور نہ ان کا شک باقی رہا۔ نتیجہ  
 یہ ہوا کہ ملا اس کام کو ابن سعود کا کام نہیں بلکہ اپنا ذاتی کام تصور کرنے  
 لگے۔ اس اصلاحی، یا تنظیمی جماعت کا نام ”الاحخوان“ رکھا گیا۔  
 اس کے بعد ہی ریاض کے کئے ملاؤں نے قبائل کے ملاؤں اور  
 پیش اماموں کے پاس احکامات بھجوا دیے کہ وہ اہل قبائل کو اس امر کی  
 تعلیم دیں کہ

**مسلم کا خون مسلم کو کبھی نہیں ہا چاہی رسول خدا کا  
 حکم ہے کہ کاشت کرو**

عرب اور بالخصوص بدوی بڑے قدامت پسند واقع ہوئے تھے،  
 ابتدا میں انہوں نے اس تنظیم سے ناراضی کا اظہار کیا۔ وہ نہیں چاہتے  
 تھے کہ ان کی روایات میں کسی قسم کی تبدیلی کی جائے یا انہیں کسی بات کا

پابند کر کے ان کی آزادی کو سلب کر لیا جائے۔ البتہ سب سے پہلے آل حرب نے اس اسلیم کی بڑی گرم جوشی کے ساتھ تائید کی اور اس قبیلہ کے شیخ سعد ابن مطیب نے اس کام کے لیے کچھ رضا کار فراہم کر لیے اور ارطاویہ میں قیام کیا۔

ارطاویہ ایک اجڑا ہوا بخر مقام تھا۔ البتہ وہاں اچھے پانی کے چند چشمے تھے، کچھ جانور چرتے تھے اور سفر پھرتے اور پانی پیا کرتے تھے۔ ان چشموں کے اطراف کی زمین افتادہ تھی اور چند کھجور کے درخت ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔

ابن سعود نے اس معاملہ میں خاطر خواہ دلچسپی لی۔ مطیب اور اس کے ہمراہیوں کو روپیہ پیسے سے امداد دی، زراعت کے طریقے بتائے، خود کام کی نگرانی کی، ایک مسجد بنوائی، پابند مصلیوں کو بطور تحفہ کے ایک ایک ہندوق عطا کی۔ اس طرح سے ارطاویہ آہستہ آہستہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا، ایک چھوٹے گاؤں سے ایک اچھا شہر بن گیا۔

ارطاویہ کے باشندے علاقہ نجد کے سب باشندوں سے زیادہ مذہبی اور کٹے دہانی تھے۔ صرف قرآن مجید ان کے پیش نظر تھا۔ ان لوگوں نے عربی عامہ پہننا ترک کر دیا اور امتیاز کے لیے سفید شلوار باندھنے لگے۔ ”الاخوان“ کا نام ان کے لیے بہت ہی ہمت افزا ثابت ہوا۔ ارطاویہ کی اس ترقی کو دیکھ کر اکثر قبائل ”الاخوان“ کی جماعت میں شرکت کے لیے راضی ہو گئے۔ قبائل مطیر میں بھی جوش پیدا ہو گیا۔

دویش نے ابن سعود سے مل کر صلح کر لی اور ابن سعود نے اسے ارطاویہ کا  
 عامل مقرر کر دیا۔ اس طرح قبائل میں اتحاد پیدا ہوتا چلا اور وہ قبیلے جو  
 کبھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اب محبوب دوست  
 بننے لگے اور باہمی مخالفتوں کو دور کر کے ایک دوسرے کا ساتھ دینے  
 لگے۔ اس سے قبل ابن سعود جنگجوؤں کا انتخاب بہادر اور جنگجو قبائل سے  
 علیحدہ علیحدہ کیا کرتا تھا لیکن اب اس نے ان کا انتخاب ارطاویہ کے  
 باشندوں سے کیا جس میں مختلف قبیلوں کے لوگ شامل تھے اس طرح  
 ”الاخوان“ کی تنظیم نے بیگانگی کا پردہ اٹھایا نگلت کا رنگ جمادیا۔

---

# ساتواں باب

## نشیب و فراز

---

ابن سودا دھڑ اپنے تعمیری کاموں میں مصروف تھا کہ اس دوران میں انگریزوں اور جرمنوں میں خوب تن گئی۔ جرمنی اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے تلے ہوئے تھے اور انگریزی حکومت اسے آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ انگریزوں کا پلہ بھاری تھا اور وہ ان تمام مقامات پر قابض تھے جو جرمنوں کے مفید مطلب تھے چنانچہ ایک طرف مصر، نہر سوئز اور بحیرہ قلزم اور دوسری طرف میسوپوٹامیا اور خلیج فارس پر انگریزوں کا تسلط تھا جس سے جرمنوں کے راستے محدود ہو گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ جرمنوں کی ترکوں سے دوستی تھی اور ترک عرب پر حکمراں تھے تاہم انگریزوں کا زور زیادہ تھا اور ترکوں کی حکومت بے نام تھی

انگریز اور جرمن دونوں اپنے مقاصد کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ان کے قاصد سرکاری اور غیر سرکاری طور پر عرب قبائل کے حکمرانوں کے پاس پہنچ کر ان سے دوستی اور اتحاد بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے، امام مین حسین، شریف مکہ، آل رشید، شیخ منطفک، مبارک اور ابن سعود۔ ان سب کو روپیہ پیسہ اور آلات حرب کا لالچ دیا گیا۔ ابن سعود کے پاس کویت سے انگریزی قونصل شیکسپیر اور بصرہ اور مدینہ سے ترکی اور جرمنی نمائندے علیحدہ علیحدہ ملنے کے لیے آئے۔ ابن سعود کے آگے اب ایک وقت طلب مسئلہ پیش ہو گیا۔ ساتھ دے تو کس کا؟ جنگ تو بدیہی تھی اور ابن سعود کا کسی کے ساتھ ہو جانا لازمی۔ مگر سوال یہی تھا کہ کس کی جانب داری مفید ہو سکے گی۔ ترک قریب ترین حکومت تھی، جرمن اس کی پشت پر تھے۔ مال اور دولت اور فوجی طاقت کی بھی ان کے پاس کمی نہ تھی مگر بہ لوگ اس کے دشمن اور رشیدیوں کے دوست تھے چنانچہ کچھ دنوں پہلے انہوں نے اس کو بے دخل کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ ان کے ساتھ اس کی بناء مشکل تھی۔ اب رہے انگریز۔ یہ اس کے دوست بھی تھے اور جرمنوں اور ترکوں کے مقابلہ میں کسی طرح دبتے نہ تھے۔ البتہ عرب سے انہیں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی اور وہ عرب سے اپنا تعلق صرف اس لیے باقی رکھنا چاہتے تھے کہ ان کے لیے ہندوستان تک راستہ کھلا رہے اور دوسرے وہ ایران میں اپنے تیل کی حفاظت آسانی سے کر سکیں۔ بہر حال ابن سعود جانتا تھا کہ انگریز ہندوستان اور مصر پر تسلط



رکھتے ہیں۔ مسقط، حضرموت، عمان اور عدن سے ان کی دوستی ہے، بحری اور بری قوت نمایاں ہے، فوجی تنظیم بھی کسی طرح کم نہیں۔ چنانچہ انہوں نے کویت سے جب ترکوں اور رشیدیوں کو نکال باہر کیا تو باوجود اس کے کہ جرمن ان کی پشت پناہ تھے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اس لحاظ سے انگریزوں سے دوستی کرنی اس کے لیے مفید نظر آئی۔ تاہم پھر وہی سوال پیش ہوا کہ ترک اور جرمن اس سے قریب تھے اور انگریز دور۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ مبارک کے پاس گیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ مبارک اس کے خلاف سازشیں کر رہا ہے تاہم اس نے اپنے دل میں کہا

”میں نے مبارک کو اپنا باپ کہا ہے، ایسے آٹے وقت میں  
اپنی مشکلات اسی کے آگے پیش کروں گا۔“

ابن سعود نے مبارک کو اطلاع بھیجی کہ وہ اس سے ملنے کا آرزو مند ہے، مبارک نے اسے منظور کیا اور دونوں مقررہ وقت پر نجد اور کویت کے درمیان ایک گاؤں پر ملے۔ مبارک نہایت شان و شوکت اور جلوس کے ساتھ آیا، اس کے آگے اور پیچھے مسلح سواروں کا محافظ دستہ نیلی اور سنہری وردیاں پہنے ہوئے ہمراہ تھا۔ ابن سعود اپنے محافظ دستہ کے ہمراہ نہایت سادگی کے ساتھ پہنچا اور دونوں میں بڑے تپاک سے ملاقات ہوئی، ابن سعود نے پہلے کی طرح مبارک کا احترام کیا اور مبارک بھی بڑے پن سے ملا۔ دونوں نے فی الوقت اپنے ذاتی جھگڑوں کو بالائے طاق رکھ کر نفس معاملہ پر گفتگو شروع کر دی اور کافی بحث و

مباحثہ کے بعد مبارک نے صلاح دی کہ انگریز ہوں یا چاہے جرمن، کسی کے ساتھ بھی اتحاد اور دوستی فضول ہے۔

مبارک کی یہ ایک چال تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ابن سعود کا دائرہ اثر وسط عرب تک ہی محدود رہے، ابن سعود اس بات کو سمجھ گیا۔ دل میں بہت طیش کھایا لیکن اپنے جذبات کو ظاہر ہونے نہ دیا بلکہ اس نیکٹ صلاح پر مبارک کا شکریہ ادا کیا۔ دونوں خذہ پیشانی کے ساتھ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے، ابن سعود سیدھے ریاض پہنچا۔

ابن سعود نے ابھی کوئی قطعی تصفیہ نہیں کیا۔ دونوں فریقوں کے ساتھ وہ نہایت عمدگی کے ساتھ سیاسی انداز میں گفتگو کر رہا تھا اور کوئی یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کس کا ساتھ دیگا، اس نے ہر دو فریق کو اپنے ماضی الضمیر سے متعلق مغالطہ میں رکھا۔ ترکوں سے نہایت کشادہ پیشانی سے گفتگو کی اور اپنے اونٹ اور گھوڑے ان سے کافی دام لے کر فروخت کر دیے، شکیسر بھی اس کا بڑا وفعلصانہ رہا اور اس سے کافی دولت گھسیٹی۔

(۲)

ابھی ابن سعود اپنے منصوبے گھڑ رہا تھا کہ یورپ میں ”جنگ عظیم“ چھڑ گئی۔ فرانس اور روس جرمنی کو کچل ڈالنا چاہتے تھے، انگلستان نے ان کا ساتھ دیا، اس کے بعد ترکوں نے جرمنوں کا ساتھ دیا اور اس طرح ترک اور انگریز ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔

ابن سعود کے لیے اب یہ نہایت ہی ضروری تھا کہ وہ کسی کے ساتھ

ہو جائے یا خود اپنے آپ کو مستحکم کر لے۔ اس نے فوراً شیوخ کے نام پر دئے  
 صحیحہ اور حالات کا اظہار کر کے کٹواہش ظاہر کی کہ ایسے نازک وقت میں  
 عرب قبائل کا متحد ہو جانا ضروری ہے ورنہ انگریز یا ترک جب عرب پر  
 حملہ آور ہونگے تو اس وقت ملک کو بچانا بس سے باہر ہوگا۔ لیکن کسی نے  
 اس کی اس آواز پر جنبش تک نہ کی بلکہ حائل میں رشید کا ایک جانشین  
 اپنے مخالفین کو شکست دے کر ترکوں کے ساتھ مل گیا۔

حسین ترکوں کا آدمی تھا لیکن وہ اپنے لڑکے عبداللہ کے ذریعہ مصر  
 میں انگریزوں سے ساز باز کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ شامی انقلابیوں سے  
 مل کر وہ ”عرب اتحاد“ کی ایک اسکیم بنا رہا تھا جس کا صدر خود ہونا چاہتا  
 تھا۔ انگریزوں نے بھی اس معاملہ میں اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ کیونکہ  
 وہ ہر طرح اپنی دوستی اور اتحاد کے دائرہ کو وسیع کر کے جنگ عظیم کو فتح  
 کرنا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے حسین نے انگریزوں سے اتحاد، روپیہ پیسے  
 کی امید اور ”عرب اتحاد“ کے گھمنڈ میں ابن سعود کو ٹھکا سا جواب دیدیا۔  
 مبارک معمر، سنجیدہ، دور رس اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے حالت  
 کا لحاظ کرتے ہوئے فوراً انگریزوں سے اتحاد کر لیا۔ لیکن ابھی وہ خطرہ ہی  
 میں تھا کیونکہ معاہدہ کے باوجود انگریزوں نے اس کے پاس فوجیں نہیں  
 بھجوائیں اور ممکن تھا کہ کسی وقت بھی ترک بصرہ کی طرف سے اس پر  
 حملہ کر دیں۔ اسی لیے اس نے ابن سعود سے امداد طلب کی لیکن اس نے  
 کوئی جواب نہ دیا بلکہ غیر جانبدار ہی رہنا مناسب سمجھا۔

سلاطین کے اوائل میں انگریزوں نے فاؤ نامی مقام پر پڑاؤ ڈالا۔  
 ترکوں کو وہاں سے بھگا دیا اور بصرہ میں داخل ہو کر اپنی فوجیں جمع کرنی  
 شروع کیں۔ اور ابن سعود کے پاس اپنے سفیر شکسپیر کو روانہ کیا۔ انگریزوں  
 کی نظر دیگر عرب حکمرانوں سے زیادہ ابن سعود پر تھی کیونکہ ایک تو اس کی  
 حیثیت مسلم ہو چکی تھی اور دوسرے وہ وسط عرب پر قابض تھا اور  
 جس طرف چاہتا اور جب چاہتا آسانی سے حملہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ  
 اگر ابن سعود ترکوں سے اتحاد کر لیتا تو پھر نجد کی طرف انگریزوں کا راستہ  
 مسدود ہو جاتا اور انہیں محض اس کی مدافعت کے لیے کافی سے زیادہ  
 فوجی طاقت صرف کرنی پڑتی شکسپیر نے اس مقصد کی تحت ابن سعود کو  
 بہت کچھ التماسیدھا سمجھایا اور بہت لالچ دیا لیکن وہ اپنی جگہ مستقل  
 رہا اور اتحاد پر راضی نہ ہوا۔ یہ حال دیکھ کر شکسپیر نے دوستانہ  
 غیر جانبداری کے لیے کوشش کی۔ ابن سعود اس پر فوراً راضی ہو گیا۔  
 اس اثناء میں خبر آئی کہ رشیدی نجد کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ  
 ترکوں کی آنکھ تھی۔ ترکوں نے یہ سمجھ کر کہہیں ابن سعود انگریزوں سے  
 معاہدہ نہ کرے، رشیدیوں کو رقبہ اور حربی امداد دی اور انہیں  
 ابن سعود پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا۔

یہ خبر ملتے ہی ابن سعود نے اپنے سپاہیوں کو جمع کرنے کے لیے  
 تیز رفتار اونٹوں پر قاصدوں کو ادھر ادھر بھیج دیا۔ ملیر، حمان اور  
 دو اسیر کے سوار جمع ہو گئے، نجد کے شہروں اور گاؤں سے پیادہ

سپاہی آپہنچے اور ”اخوانی نوآبادیات“ کے جنگجو بھی بہت ہی جوش و خروش کے ساتھ آئے۔ یہ ان کی آزمائش کا پہلا موقع تھا۔ جب تین ہزار آدمی جمع ہو گئے ابن سعود نے شمال کی طرف کوچ کیا۔ جراب نامی مقام پر دشمنوں سے مدھ بھڑ ہوئی۔ ابن سعود نے فوراً حملہ کر دیا۔ یہ لڑائی بالکل ریگستانی طرز پر ہوئی۔ جانبین کے سپاہی نعرہ لگاتے ہوئے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑ رہے تھے۔

ابن سعود مطیع کے رسالہ کی سرکردگی کر رہا تھا۔ دونوں طرف سے برابر گولیاں چل رہی تھیں اور دونوں فوجیں آگے کی طرف بڑھ رہی تھیں بالآخر جب دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوئے تو تلواریں نیام سے باہر نکل گئیں۔ دوپھر سے شام تک خوب زور کی لڑائی ہوئی، کبھی یہ کامیاب رہے اور کبھی وہ تا آن کہ نجدی مستقل طور پر پسپا ہونے لگے، جمائینوں نے یہ حال دیکھ کر خمیسوں کو لوٹنا شروع کیا۔ اس سے نجدی پست ہمت ہو گئے، ابن سعود نے انہیں سنبھالنے کی ممکنہ کوشش کی، ”الاخوان“ مضبوط اور ثابت قدم رہے لیکن اوروں نے دل چھوڑ دیا۔ یہ حالت دیکھ کر ابن سعود کو مجبوراً واپس لوٹنا پڑا اور جس وقت وہ ریاض پہنچا اس کے ساتھ صرف چند آدمی تھے۔

اس لڑائی میں شیکسپیر مارا گیا۔ وہ ریگستانی جنگوں سے بالکل نا آشنا تھا۔ ابن سعود نے حالانکہ اسے منع بھی کیا کہ وہ اس کے ساتھ شریک نہ رہے لیکن شاید اس کی قصا پکار رہی تھی جو وہ اس کے ساتھ لے گیا۔

ابن سعود کو شکست فاش ہو گئی۔ پھر سے ایک مرتبہ عجمانیوں نے اسے دھوکا دیا۔

یہ خبر تمام ملک میں بہت جلد پھیل گئی کہ ابن سعود نے شکست کھائی اور وہ بھی ترکوں اور رشیدیوں کے مقابلہ میں۔ اس خبر کو پھیلا میں بددیولوں کا زیادہ ہاتھ تھا۔ قافلوں کے ذریعہ احساء، حجاز، بغداد اور شام میں بھی اس کی اطلاع ہو گئی عتیبہ اور قرہ قبائل نے خوشیاں منائیں کہ ابن سعود کی حکومت کا جوا ان کے کندھوں سے اتر گیا اور وہ پھر سے لوٹ مار اور ظلم و تشدد کے لیے آزاد ہو گئے۔

ابن سعود کے آگے اب بہت زبردست خطرہ تھا، نہ تو اس کے پاس کافی پیسہ تھا اور نہ کافی سپاہی۔ دنیا میں چوڑی جنگ پھڑی ہوئی تھی۔ ترک اس کے سخت مخالف ہو گئے تھے اور روپیہ دے دے کر قبائل کو اس کے خلاف بھڑکا رہے تھے، بدخو عجمانیوں نے اب کی دفعہ پھر اپنے کمینہ پن کا اظہار کیا۔ ابن سعود ان سب حالات کا بنور مطالعہ کر کے موقع کی نزاکت کو سمجھ گیا۔ اگر اس موقع پر ذرا بھی وہ پست ہمتی سے کام لیتا تو اس کے سارے کیے دھرے پر پانی پھر جاتا۔

ابن سعود نے اس موقع پر ایک چال چلی۔ اس نے اپنے الاخوانی رضا کاروں کو جمع کر کے شمریوں پر حملہ کا اعلان کر دیا کیونکہ قاصدوں نے اسے اطلاع دے دی تھی کہ شمری قبائل اس وقت جنگ کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمریوں نے ابن سعود سے ایک عارضی

صلح کر لی۔

اس اثنا میں انگریز ملک پر ملک فتح کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور نجد ا تک پہنچ چکے تھے۔ ابن سعود نے اب ذرا بھی تامل نہیں کیا اور صوبہ احساء میں بندر گاہِ عجمیر پر انگریزوں سے ایک معاہدہ کر لیا اس طرح کا ایک معاہدہ اس نے مبارک سے بھی کیا کیونکہ خود مبارک اس کی امداد کا طالب تھا۔ آل عجمان کویت پر ایک ہنگامہ برپا کر رہے تھے، مبارک چاہتا تھا کہ انہیں سزا دے کر اپنا لوٹا ہوا مال ان سے واپس لے، ابن سعود اس شرط کے ساتھ اس پر راضی ہو گیا کہ مبارک اسے مالی اور فوجی امداد دے۔

اس تھوڑی سی امداد کے ساتھ ابن سعود اپنے بھائی سعد اور جلوی کو لے کر عجمانیوں کو سزا دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس دفعہ اسے بڑی دشواری پیش آئی اس لیے کہ ایک تو عجمانی اس کے جانی دشمن تھے اور دوسرے وہ قبائل جو اس کی روز افزوں ترقی کو دیکھ کر دل میں کرٹھتے تھے، وہ بھی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہو چکے تھے۔ اس لحاظ سے ابن سعود کو ہر طرف سے حملہ کا خطرہ لگا ہوا تھا۔ نہ صرف یہی بلکہ عجمانی بہادر اور جنگجو بھی تھے اور بالطبع باغی ہونے کے باوجود ان میں خود آپس میں زبردست ایکٹھا اور جنگ کے لیے وہ بہت جلد پانچ چھ ہزار سپاہی آسانی سے فراہم کر سکتے تھے۔ یہ بھی ابن سعود کا خاتمہ کرنے کے لیے تلے ہوئے تھے۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود ابن سعود عجمانیوں کے خلاف

جنگ کرنے تیار ہو گیا۔

(۳)

ہتلان نے جب یہ سنا کہ نجدی اس کے مقابلہ کے لیے آسے ہیں تو فوراً جنوب میں ربع الخالی کی طرف ہٹنے لگا کہ نجدیوں کو کھانے پینے کی تکلیف ہو۔ چنانچہ ابن سعود نے جب ان کا پیچھا کیا تو اسے بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں، سپاہی تھک کر چور ہو گئے اور پانی کی سخت تکلیف ہونے لگی بہر حال یہ لوگ دھوپ کی تکلیف برداشت کرتے ہوئے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ بالآخر کترہن کے سامنے عمانیوں سے مقابلہ ہوا، ہتلان نے چالاکی یہ کی تھی کہ اپنے تھوڑے آدمی سامنے بھجوا دیے تھے اور اصل فوج پیچھے رکھ لی تھی کہ ابن سعود کو اس کے سپاہیوں کی تعداد کا کوئی صحیح اندازہ نہ ہو سکے چنانچہ جیسے ہی ابن سعود کے سپاہی آگے بڑھے ہتلان کے آدمیوں نے چوطرف سے انہیں گھیر لیا۔ بڑے زور کی لڑائی ہوئی۔ اب تو ہر شخص اپنی جان بچانے کے لیے لڑ رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے اندر سعد گولی کا نشانہ بن گیا۔ خود ابن سعود بُری طرح زخمی ہوا اس کے فوجی پریشان و ہراساں ہو گئے۔ آخر ابن سعود کے بھاگتے ہی بن آئی۔ ابن سعود اب بڑی مصیبت میں پڑ گیا۔ اس کا سارا وقار جاتا رہا۔ سوائے ”الاخوان“ کے باقی سب قبائل اس کو ملایا میٹ کرنے کے لیے تیار تھے۔ رشیدیوں نے معاہدہ سے انحراف کر دیا اور بریدہ پر چڑھائی کرنے کے لیے بڑھنے لگے۔



اس حالت میں بھی ابن سعود نے دل نہیں چھوڑا۔ اس نے فوراً ریاض میں اپنے والد کے پاس اور کویت میں مبارک اور انگریزوں کے پاس امداد کے لیے آدمی روانہ کیے۔ اس اثناء میں قسمت نے ابن سعود کا ساتھ دیا۔ بریدہ کے باشندوں نے فہد کی سرگردگی میں رشیدیوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ ہتھلان چاہتا تھا تو ابن سعود کا تعاقب کر کے اسے بھگا دیتا لیکن اس کی بدوی ذہنیت نے اس طرف اسے متوجہ نہیں کیا بلکہ وہ احساء کے جنوب میں گاؤں لوٹنے اور شہر ہفوف کا محاصرہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔

عبدالرحمن کو ریاض میں جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو وہ اپنے کچ عہدت سے نکل کر اطراف کے گاؤں میں گیا اور وہاں کے لوگوں کو جمع کرنے لگا۔ جب ایک کافی فوج بن گئی تو اسے اپنے بیٹے محمد کی سرکردگی میں ابن سعود کی امداد کے لیے روانہ کیا۔ انگریزوں نے روپے اور ہتھیار روانہ کیے۔ مبارک نے شروع میں ذرا شش و پنج کی لیکن بعد میں اپنے بیٹے سلیم کی سرکردگی میں تھوڑی سی فوج روانہ کر دی۔ ابن سعود کی پھسلیوں پر سخت چوٹ آئی تھی لیکن اس نے کسی سے اس کا اظہار نہیں کیا۔ بھائی کی موت نے اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکا دی ہتھلان اور عجمانیوں سے بدلہ لینے کا قطعی فیصلہ کر لیا بلکہ قسم کھائی۔ اور امداد کی توقع میں بیکار نہیں بیٹھا بلکہ عجمانیوں کے مقابلہ کے لیے آدمی جمع کرنے لگا ایسے میں سلیم اور محمد بھی آگے جس سے

اس کی فوجی طاقت میں ایک گونہ اضافہ ہو گیا۔

(۴)

عجمانی ہنفوف کے محاصرہ سے تنگ آچکے تھے۔ استقلال کے ساتھ محاصرہ کرنا ان کی فطرت کے خلاف تھا، وہ تو صرف لوٹ مار کے عادی تھے اور اسی میں انہیں لطف آتا تھا۔ کئی دن تک ہنفوف کا محاصرہ کرنے کے بعد جب کچھ عمدہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا تو چند آدمی اپنے اپنے مکان چلے گئے، چند ادھر ادھر لوٹ مار کرنے لگے اور چند اطراف و اکناف میں پھیل گئے۔ اس وقت عجمانی فوج منتشر حالت میں تھی۔

ابن سعود نے محمد اور سلیم کو لے کر عجمانی فوج کا رخ کیا۔ عجمانیوں نے سعودی فوج کو بڑھتا ہوا دیکھ کر گولیاں برسائی شروع کیں۔ ایک گولی ابن سعود کے پیر میں لگی اور وہ گھوڑے سے گر پڑا۔ محافظ دستہ نے فوراً اسے اٹھا کر خیمہ میں پہنچا دیا۔ اس واقعہ سے فوج میں کسی قدر بے چینی پیدا ہو گئی۔ عجمانی فوج تو پہلے ہی سے منتشر تھی، انہیں یہ اچھا موقع آیا اور وہ چپکے سے چل دیے۔

ابن سعود سخت تکلیف کے باوجود حاضر دماغی سے کام کر رہا تھا، اس نے محمد اور سلیم کو ان کے تعاقب کے لیے روانہ کیا۔ ان دونوں نے تیزی کے ساتھ پیچھا کر کے عجمانیوں کو ملا لیا، لیکن بجائے اس کے کہ سلیم عجمانیوں پر حملہ کرتا۔ ابن سعود کا ساتھ چھوڑ کر عجمانیوں کے ساتھ مل گیا۔

ابن سعود اب بڑے چکر میں آگیا۔ ایک تو درد کی تکلیف اور دوسرے اطراف کے لوگوں کی چہ میگوئیاں۔ کوئی کہتا تھا ”اب عجمانی آگئے ہماری خیر نہیں، وطن واپس جانا ہی مناسب ہے“ دوسرا کہتا ”دزخم کاری ہیں۔ ابن سعود کی خیر نہیں، خدا ہی اچھا کرے تو کرے“ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر شخص کچھ نہ کچھ کہے جا رہا تھا، حتیٰ کہ ابن سعود کے بہترین دوست اور ساتھی جو اس کی بڑی سے بڑی مصیبت میں مونس و غم خوار تھے، اب کسی قدر پیٹے نظر آنے لگے۔

یہ حال دیکھ ابن سعود نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ زخم کچھ لیے زیادہ نہیں ہیں، درد نام کو نہیں اور اب بھی میں پہلے کی طرح بہادری اور جو انفرادی سے لڑ سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے پاس کے گاؤں کے ایک شیخ کو بلوایا اور اس سے ایک ایسی کنواری لڑکی لانے کی فرمائش کی جو اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو، لڑکی آئی۔ ابن سعود سے اس کا عقد ہوا۔ اس کے بعد ابن سعود نے حکم دیا کہ فوج میں آج خوشیاں منائی جائیں۔ ابن سعود کا یہ فعل اس قدر نفسیاتی تھا کہ جس سے اس نے ٹوٹی ہوئی ہمت میں ایک جان ڈال دی، عرب اس جوش اور اس کام کو تحسین و فخر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اب ان میں ایک نئی روح آگئی۔

ابن سعود کے ساتھی اب اس درجہ جوش میں تھے کہ چاہتا تو وہ عجمانیوں کی ہڈی ہڈی کو توڑ سکتا۔ محمد بھی اس کے لیے تیار ہوا تھا۔

سلیم کی غداری نے اسے اور بھی آگ بگولہ بنا رکھا تھا۔ لیکن ابن سعود بڑا لکھتہ رس اور سنجیدہ مزاج انسان تھا۔ سلیم پر حملہ کرنا مبارک سے علانیہ دشمنی مول لینی تھی، اس لیے اس نے محمد کو حملہ سے روکا اور مبارک کے نام ایک خط بھیجا۔

”یا والدی۔ میں نے صرف آپ کے احترام کی خاطر سلیم کو چھوڑ دیا ورنہ اس کے کیے کی سزا دیتا“

مبارک نے ابن سعود کو روکھا سا جواب دیا اور اٹے اسی پر جھوٹا الزام دھرا، اسی کے ساتھ مبارک نے ایک خط سلیم کو لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

”بیٹے میں نے تمہیں لڑنے کے لیے نہیں بلکہ واقعات کا مشاہدہ کرنے کے لیے بھیجا تھا..... اگر ابن سعود عجمانیوں کو شکست دے تو تم عجمانیوں کی امداد کرو اور اگر عجمانی ابن سعود کو شکست دیں تو تم ان کا مقابلہ کرو اور نہ کسی کو مردو“

جاسوسوں نے یہ خط راستہ سے اڑا کر ابن سعود کے پاس پہنچا دیا۔ ابن سعود کو اس پر بہت غصہ آیا۔ یہ مبارک کی غداری کا کھلا ثبوت تھا۔ اس نے اپنے سب لوگوں کو جمع کر کے مبارک کی غداری کا حال سنایا۔ سبہوں نے رائے دی کہ فوراً حملہ کر دینا چاہیے اور اگر اسی سلسلہ میں کویت سے بھی جنگ کرنی پڑے تو حرج نہیں، ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔

”بے شک ایسا ہی ہونا چاہیے“ ابن سود نے کہا اور قرآن پاک کی ایک آیت تلاوت کر کے فوج کو کوچ کا حکم دیا۔  
 جیسے وہ چلا، اطلاع آئی کہ سلیم عجمیوں کو چھوڑ کر فوراً کویت چلا گیا ہے کیونکہ مبارک کا ایک انتقال ہو چکا تھا۔  
 ”خدا ہمارے ساتھ ہے اور ہم خدا کے لیے ہیں“ یہ کہہ کر ابن سود سیدھا عجمیوں کی طرف روانہ ہوا۔

یہ جنگ بڑی معرکہ آرا تھی۔ ابن سود اپنے بھائی سعد کا بدلہ لینے کے لیے تلا ہوا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہتلان کے خاندان کے ایک فرد کو بھی زندہ نہ چھوڑے اور اس طرح قبائل کو ان کی غداری کا مزہ چکھا کر ایک ایسی مثال قائم کرے کہ آئندہ پھر کوئی قبیلہ ایسی حرکت نازیبا کا مرتکب نہ ہو۔ عجمانی بھی اسی طرح ابن سود کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان کی موروثی آزادی میں رخنہ انداز ہو کر انہیں اپنا محکوم بنائے۔ وہ بھی مقابلہ کے لیے ہر طرح سے تیار تھے۔

۹۱۶ء میں تمام سال یہ معرکہ رہا۔ کبھی یہ جیتے اور کبھی وہ۔ بالآخر ابن سود نے عجمیوں کو مسلسل شکستیں دے کر پسپا کر دیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ابن سود کے ساتھی زیادہ تر ”الاخوان“ جماعت کے لوگ اور گاؤں والے تھے۔ یہ ثابت قدم اور مستقل مزاج تھے اور عجمانی لٹیے۔ انہیں لوٹ مار کر کے گھر میں آرام کی نیند سنونے میں مزہ آتا تھا،

انہیں بھلا مستقل جنگ سے کیا واسطہ؟ نتیجہ یہ ہوا کہ شروع میں تو انہوں نے اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے بہت کچھ مقابلہ کیا لیکن جب سعودی ہمت اور استقلال کے ساتھ مقابلہ کرنے لگے تو وہ منتشر ہو گئے۔ بہر حال یہ جنگ بہت زور دار رہی۔ مردوں اور عورتوں دونوں نے اس میں کافی سے زیادہ حصہ لیا۔ مردوں کا کام لڑنا اور عورتوں کا کام زخمی آدمیوں کو ہلاک کرنا تھا۔ ایک مرتبہ ایک زخمی دہابی نے ایک عجمانی عورت سے پانی مانگا۔ اس عورت نے اسے اتنا مارا کہ بے چارہ مر گیا۔ ایک دفعہ ایک زخمی عجمانی کنوئیں کے پاس دم توڑتا تھا امداد کے لیے اس نے ایک دہابی عورت کو پکارا۔ عورت آئی۔ اور بندوق اور ٹوٹے لے، اسے کنوے میں ڈھکیل کر فخریہ انداز میں گھر کی طرف چلی گئی۔

عجمانی جب بھاگنے لگے تو ابن سعود کے لوگوں نے نہایت بے رحمی سے ان کے گاؤں جلا کر انہیں ہلاک کر دیا۔ ہتھلان اور اس کے چند رفقاء احسا سے ہوتے ہوئے کویت میں داخل ہوئے۔ ابن سعود نے ان کا مطالبہ کیا تاکہ ان کا خاتمہ کر دے۔ لیکن یہاں مبارک کا بیٹا جابر حکمران تھا اور اس کے کمزور ہونے کی وجہ سے ساری حکومت کی باگ سلیم کے ہاتھ میں تھی سلیم نے صاف انکار کر دیا۔ چاہتا تو وہ کویت پر بھی حملہ کر سکتا تھا لیکن ایسے حملہ سے اس نے جو انگریزوں نے معاہدہ کیا تھا وہ ٹوٹ جاتا تھا اس لیے وہ فی الوقت خاموش

رہ گیا لیکن قسم کھالی کہ جب کبھی بھی موقع ملے وہ سلیم کو اپنے کئے کا مزہ چکھائے گا۔

اس کے بعد ابن سعود نجد واپس آیا۔ اکثر قبیلے جو اس کی موقعی شکست سے بدظن ہو کر اس کے خلاف سراٹھانے لگے تھے اب چپک کر رہ گئے۔ جمہانیوں کے ساتھ اس کا سلوک حد درجہ سخت رہا البتہ جن قبیلوں نے اس کی حکومت کو بلاچوں و چرا تسلیم کیا اور جو وقتاً فوقتاً اس کے پاس اپنے فوجی دستے روانہ کرتے رہے، ان کے ساتھ ابن سعود نے اچھا برائو کیا اور بہت کچھ انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

ابن سعود پھر سے ایک مرتبہ نجد میں کامران تھا!

# آٹھواں باب

## انگریزوں سے دوستی اور سلطنت کی تنظیم

(۱)

ابن سعود برابر دو سال تک خانگی اور بیرونی معاملات میں الجھا ہوا رہا، بالآخر ۱۹۱۶ء میں اس کے قدم جم گئے اور اس کی حکومت ایک حد تک مسلم ہو گئی۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۶ء تک عربستان کے سرحدی مقامات پر سخت جنگ ہوئی۔ انگریزوں نے شروع میں شکست کھائی، لیکن جب ان کی مزید فوج کمات کے لیے آگئی تو انہوں نے آسانی کے ساتھ بغداد پر قبضہ کر کے موصل کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ اس دوران میں جنرل آلن بی Allenby بیت المقدس کو فتح کر کے دمشق کی مافعت کے لیے تیاریاں کرنے لگا۔

یہ حال دیکھ کر حسین، شریف مکہ انگریزوں کی دوستی کا اعلان کر کے



ترکوں سے برسرِ پیکار ہو گیا۔ ابتداء میں انگریز ابن سود کی طرف جھکے ہوئے تھے اور اس کے اتحاد کو اپنے لیے ضروری خیال کرتے تھے لیکن جب جراثیم پر اسے شکست ہوئی تو ابن سود کا وقار ان کی نظروں میں کم ہو گیا اور وہ اسے چھوڑ حسین کی طرف رجوع ہوئے۔ اس کے علاوہ حسین کی دوستی انگریزوں کے لیے ایک اور وجہ سے بھی مفید ہو سکتی تھی۔ وہ یہ کہ حسین مقاماتِ مقدسہ کا والی تھا اور اس طرح سے مسلمان لازماً اسی کی طرف داری کرتے۔ مزید برآں اگر انگریز، حسین سے دوستی نہ کرتے تو جرین حجاز پر حاوی ہو جاتے، اس طرح سے انگریزوں کا راستہ رُک جاتا۔ اس لیے انہوں نے حسین کی دوستی کو فہمیت خیال کیا اور اس کے معاوضہ میں ماہانہ بیس ہزار پونڈ دینے کا وعدہ کیا اور ساتھ ہی اس کے اس کو ”عرب اتحاد“ کا صدر بنانے کا بھی لالچ دیا۔

ترکوں کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے انقلابی انجمن کے چند سربراہان آفودہ لیڈروں کو شام میں سولی دے دی۔ حسین نے ترکوں کی اس کارروائی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی، ترک اس پر بہت بگڑے اور ترکی گورنر جمال پاشا نے حسین کو سخت دھمکی دی اور ساتھ ہی اپنی قوت کو مستحکم کرنے کے لیے مدینہ میں اور فوج روانہ کی۔

اس کے بعد حسین نے اور سر اٹھایا اور بغاوت کر کے اپنے آپ کو عرب کو آزادی دلانے والا لیڈر جتلا نا شروع کیا۔ حسین کے بیٹے علی، عبداللہ اور فیصل نے مدینہ پر دھاوا کر کے ترکوں کو نکل باہر کر دیا۔

ترکوں نے پھر سے ایک زوردار حملہ کیا اور جازیوں کو ساحل تک بھگا دیا۔ حسین نے انگریزوں سے امداد طلب کی۔ شروع میں تو انگریزوں نے کچھ زیادہ توجہ نہ دی لیکن جب حسین کی حالت تقسیم ہو گئی تو انہوں نے آخر وقت میں بندرگاہ جدہ اور مینوع پر اپنے چند جنگی جہاز روانہ کیے، روپیہ پیسہ، ہتھیار اور بندوقوں سے بھی مدد کی اور مزید امداد کے لیے کرنل ٹی۔ ای لارنس کو روانہ کیا۔ اس امداد نے جازیوں کی ہمت کو خاصا بڑھا دیا۔ لارنس کی قیادت ان کے لیے بہت مفید ثابت ہوئی۔ سونا دے دے کر حسین نے عرب کے بہترین جنگجو فراہم کر لیے حتیٰ کہ نجد کے بعض بہترین سپاہی بھی سونے کے لالچ میں اس کے پاس آ گئے۔

ہر طریقہ سے مطمئن ہو کر حسین نے ساحل کا رخ کیا اور ریلوے لائن تک پہنچ گیا۔ دمشق اور مدینہ کے درمیان جو ریلوے کی پڑی تھی اس کو توڑ ڈالا۔ اس طرح سے ترک مدینہ میں بے یار و مددگار رہ گئے۔ لارنس اور فیصل کے زیر قیادت، حسین کے ساتھیوں نے عقبہ پر قبضہ کر لیا اور اسے اپنا مرکز قرار دے کر آگے کا رخ کیا۔ رستہ میں النبی کی فوج مل گئی جو دمشق پر دھاوا بولنے کے لیے شمال کی طرف کوچ کر رہی تھی ترک ہر طرف سے معصیت میں گرفتار ہو گئے۔ انگریز بُری طرح ان کا پیچھا کیے ہوئے تھے۔ انہوں نے نہ صرف ترکوں کو مختلف مقامات سے بے دخل کر دیا بلکہ وہ ایک بڑی طاقت فراہم کر کے ملک عرب سے ترکوں کا نام و نشان ہی مٹا دینا چاہتے تھے۔

آئے دن انگریزوں کی فتوحات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود حالات کچھ اس قدر پیچیدہ اور نازک تھے کہ قطعی طور پر فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کس کو فتح ہو گی۔ فریقین کی طرح مطمئن نہ تھے۔ اور ہر ایک کی ہی خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ حکومتوں کو اپنا حلیف بنائیں۔ عرب کی حد تک انگریز اپنی کامل حفاظت اور امداد کے لیے ابن سعود کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ گواہوں نے اس کی ایک شکست کی بناء پر کچھ عرصہ کے لیے اس کی طرف سے توجہ ہٹالی تھی تاہم اب اس کا ساتھ ضروری تھا کیونکہ ابن سعود عرب کے پورے وسطی حصہ پر حاکم تھا اور اس حصہ ملک میں اس کا اچھا اثر تھا۔ اسی لیے انہوں نے ابن سعود کو حلیف بنانے کی خاطر سینٹ جان فلیسی کو بھیجا جو بغداد کے سیول کمشنر اسٹاف کا ایک رکن اور سیاسی افسر تھا۔ لارڈ بل ہے ون بھی اسی کے ہمراہ روانہ کیا گیا۔ ابن سعود نے اس وفد کا نہایت خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا، علماء اور رعایا کی مرضی کے خلاف انہیں ریاض کے شاہی محل میں ٹھہرایا اور خوب خاطر تواضع کی۔ بل ہے ون اور فلیسی نے مختلف پہلوؤں پر اس سے گفتگو کی۔ ابن سعود اسے خاموشی سے سنتا رہا اور اپنی رائے کو محفوظ رکھا۔ کیونکہ ایسے موقع پر جانبداری سے زیادہ غیر جانبداری کے سلوک کو وہ زیادہ بہتر خیال کرتا تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ دوسروں کا آکر کار بنے۔ انگریز بھی فی الحال یہی چاہتے تھے، انہوں نے اس غیر جانبداری کے معاملہ میں اسے ماہانہ پانچ ہزار پونڈ دینے کا وعدہ کیا۔

ابن سعود انگریزوں کو کبھی بھی امداد دینا نہیں چاہتا تھا، اس لیے نہیں کہ اسے انگریزوں سے دشمنی تھی بلکہ وہ حسین کا سخت مخالف تھا۔ اور انگریزوں کو مدد دینا باوی النظر میں حسین کو مدد دینے کے مرادف تھا۔ حسین ”عرب اتحاد“ کا صدر بننا چاہتا تھا۔ یہ اس کا ایک خواب تھا اگر بالفرض پورا بھی ہو جاتا تو ابن سعود اسے کب تسلیم کرنے والا تھا؟ حسین نے انگریزوں کی امداد سے نجد اور اطراف و اکناف کے دیگر قبائل سے اچھے جنگجو سپاہی فراہم کر لیے۔ ابن سعود اس پر گنگنلا ہو گیا اور انگریزی وفد سے کہا:

”آپ لوگ جو حسین کو مدد دے رہے ہیں، سخت غلطی ہے، جیسے ہی آپ روپیہ دینا بند کر دیں گے، دیکھ لینا کہ میں اس کے ساتھ کیسا برتاؤ کروں گا اور کس طرح تمام قبائل کو اپنے پاس بلاؤں گا۔“

بل ہے ون نے اس کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ ابن سعود کو مجبور کیا کہ وہ حائل جا کر رشیدیوں پر حملہ کرے۔ ابن سعود نے اسے ٹکاسا

جواب دے دیا

”یاد رکھئے، انگریزوں سے میری دوستی نے رشیدیوں کو غیر جانبدار بنا دیا ہے۔ تاہم میں ان پر تباہ کر ونگا بشرطیکہ مجھے بھی اسی طرح کی امداد دی جائے جس طرح حسین کو دی گئی ہے، اور ساتھ ہی اس کے اس امر کی ضمانت بھی دی جائے کہ جس وقت میں آگے بڑھتا رہوں، آپ کے حلیف سلیم اور حسین مجھ پر حملہ آور نہ ہوں۔“

گزشتہ بیس سال، ابن سعود کی زندگی لڑنے بھڑنے میں گزری۔  
 اسے نام کو آرام نہ ملا۔ اتنی بھی فرصت نہ ملی کہ وہ اپنے محل کی حالت کو  
 ٹھیک کر سکتا۔ خانگی اور بیرونی معاملات نے بُری طرح اسے گھیر رکھا تھا  
 آج وہ کسی طرف سے مطمئن ہوا تو کل اُسی معرضِ بحث میں آگیا۔ عجمانیوں کی  
 مسلسل بغاوتوں نے اسے سبق دیا کہ خود اس کے اپنے لوگوں میں اتحاد  
 نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ابن سعود کی کوئی باقاعدہ حکومت بھی نہیں تھی  
 جو آسانی سے کام چلتا رہتا۔ سارا کام ابن سعود کے سر تھا اور ہر بات کا  
 وہی ذمہ دار۔ اس کی ذرا سی نفوذش یا پست ہمتی برسوں کی محنت کو  
 خاک میں ملا دینے کے لیے کافی تھی ایسی صورت میں اسے کس طرح مبین  
 نصیب ہو سکتا؟

اب واقعات بدل چکے تھے اور ابن سعود کو کچھ آرام ملا تھا اس لیے  
 اس نے اس وقت کو ضیعت جانا اور سلطنت کا ایک باقاعدہ نظام  
 قائم کرنے کی طرف رجوع ہوا۔ مرقبیہ اور ہر شہر کے لیے شیخ اور عامل  
 مقرر کر دیے تاکہ یہ لوگ ضبط قائم رکھیں، ٹیکس وصول کریں اور ضرورت  
 پر فوج فراہم کر سکیں۔ اس انتخاب میں اس نے موروثی حقوق کا زیادہ  
 خیال رکھا تاکہ عوام میں بددلی نہ پیدا ہونے پائے۔ اس طرح کا اختتام  
 ہو لینے کے بعد خود شہروں کا اچانک دورہ کرنے لگا۔ دورہ میں وہ  
 عاملوں اور قبائل کے سربراہوں اور وہ لوگوں سے ملتا، ان کے ساتھ چاہتا

اور مساویانہ طریقہ پر برتاؤ کرتا تھا، اس طرح سے شہر کے عام حالات کو اسے کافی واقفیت ہو جاتی تھی۔ اگر کوئی ذری بھی بے ایمانی یا فساداری کرتا تو اسے کافی سزا دی جاتی تھی۔ ایک دفعہ انگریزی وفد کے رکن غلبی نے شکایت کی کہ زلفی کا عامل عثمان ترکوں کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے۔ ابن سعود نے تحقیقات کی اور ثبوت فراہم ہو گیا تو عثمان کے پاس فوراً ایک خط روانہ کیا:

”اے خدا کے دشمن! کیا میں نے تجھے قسم دے کر منع نہیں کیا تھا کہ ترکوں سے معاملہ نہ کر..... اس پر بھی تو اور تیرے بیٹے نے ترکوں سے مال و اسباب اور کھانے پینے کی اشیاء خریدیں اور اب وہ اور تو فائدہ کمانے بیٹھے ہیں۔ تیری یہ نازیبا سازش مدت العمر میرے حافظہ پر نقش رہیگی۔ میں اب تجھے برطرف کرتا ہوں، میری مملکت کو چھوڑ کر جہاں تیرا جی چاہے چلا جا۔ اگر تو نے اس حکم کی تعمیل میں ذری بھی تاخیر کی، خواہ وہ ایک گھنٹہ ہی کی کیوں نہ ہو، تو قسم ہے رب العزت کی کہ میں حاکم نہیں اگر اس سرزمین پر تیرا ذرہ بھی رکھ چھوڑا۔“

عثمان، ابن سعود کی سخت طبیعت سے خوب واقف تھا۔ خط پڑھتے ہی وہ اپنا بوریا بدھنا باندھ کر نجد سے باہر نکل گیا۔ ابن سعود نے اس طرح کا انتظام کیا تھا کہ عامل اور شیوخ دونوں

مل کر عہدگی اور اطمینان سے کام کر لیں۔ ہر ایک کے فرائض کی تقسیم اور  
 تشریح کر دی گئی کہ میاں دا وہ خود آپس میں البچہ نہ پڑیں۔ اس کے علاوہ  
 ابن سعود نے ہر ایک قبیلہ کو اپنے ہمسایہ قبیلہ کی حرکات و سکنات کا نوٹ  
 گردانا۔ ہر قبیلہ کا فرض تھا کہ اگر کوئی بازو والا قبیلہ اس کے خلاف  
 سر اٹھائے یا سازش کرنے لگے تو فوراً اس کی اطلاع ابن سعود کو دی جائے۔  
 اس طرح سے قبائل کی تلوں مزاجیوں سے ابن سعود کو کچھ دیر کے لیے  
 نجات ملی۔ سازشوں اور شرارتوں میں کمی واقع ہو گئی۔ اور اس طرح سے  
 ابن سعود کی سلطنت اب کسی قدر مستحکم ہو گئی۔

# نواں باب

## درمیانی زمانہ

(۱)

ابن سعود کی عمر اب سینتیس سال کی ہو گئی تھی (۱۹۱۷ء)۔ وہ ایک بھاری بھر کم، مضبوط جسم کا توانا انسان تھا، اس کی آنکھیں جھری اور ان میں ہلاکی جوت تھی۔ جب کبھی خوش رہتا، اس کی آنکھوں سے مسکراہٹ نمایاں ہوتی اور جب غضبناک ہوتا تو ان سے شعلے نکلنے لگتے۔ اس کی داڑھی چوڑی اور گھنی تھی۔ مونچھیں شرج کے مطابق کٹی ہوئی تھیں۔ ہمیشہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھینچے رہتی تھی۔ اس میں ہلاکی نہ تھی اور برو باری تھی، صورت سے ایک خاص دبدبہ ٹپکتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعی یہ کوئی سنجیدہ اور اُلوالعزم حکمراں ہے۔

ابن سعود کی زندگی بہت ہی سادہ تھی۔ خواہ محل میں ہو یا



سفر میں، وہ ہمیشہ کفایت شکاری سے کام لیتا تھا۔ امام کی اسے نام کو خواہش نہ تھی، محل میں بھی وہ معمولی چارپائی پر سوتا تھا، زرق برق لباس سے سخت تنفر تھا، البتہ اس کے شایہ اور حمامہ پر تھوڑا بہت زرین کام ہوتا تھا لیکن وہ بھی شرعی حدود کے اندر۔

ابن سعود بڑا ہی نفاست پسند واقع ہوا تھا، اس کی قوت ثناء بہت تیز تھی، ملکی سی خراب بو کو بھی وہ برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ”پاشا“ اس سے ملنے کے لیے آیا، بہت ہی اہم مقام پر اس سے گفتگو ہو رہی تھی۔ گرما کا زمانہ تھا اس لیے پاشا لہسن اور پیاز استعمال کر رہا تھا اور سگریٹ پر سگریٹ سلگائے جا رہا تھا۔ ان کی بوسے ابن سعود کا دم گھٹنے لگا، غلام کو آواز دی اور اگر سوز منگو کر سارے کمرہ کو دھواں دلوایا اور جب پاشا رخصت ہو کر چلا گیا تو کہنے لگا ”پاشا، یہ پاشا ہے یا خا کر وب“

ابن سعود غذا کے معاملہ میں بھی بہت محتاط تھا اور ہمیشہ سادہ غذائیں استعمال کرتا تھا، صبح تھوڑے سے دودھ، مکہ اور قوس کا ناشتہ بناتا اور شام میں روٹی، گوشت اور تھوڑے سے کھجور کھا لیا کرتا تھا۔ البتہ دن میں کئی دفعہ چاء اور قہوہ پیتا تھا۔ ابن سعود ہمیشہ مستعد رہا کرتا تھا، بیکار بیٹھنا اس کی فطرت کے خلاف تھا، ہر وقت کچھ نہ کچھ کیا کرتا تھا، سوتا بھی بہت کم تھا، رات اور دن میں مشکل سے دو تین گھنٹے سوتا ہو گا۔ وہ کہتا تھا کہ

سونے سے شعور کا بہت سا وقت بے شعوری میں ضائع جاتا ہے۔  
ابن سعود کا حافظہ بھی بڑا زبردست تھا۔ ایک وقت میں وہ دو  
منشیوں کو مختلف موضوعوں پر لکھواتا اور اس درمیان میں کئی چھوٹے  
موٹے فیصلے بھی کرتا تھا۔ اگر بیچ میں کوئی دخل دیتا تو بھی اس کا  
سلسلہ رجحان ٹوٹنے نہیں پاتا تھا۔

اس اثنا میں ابن سعود نے اپنے محل کی بھی تعمیر کرائی، اس کو  
وسیع کیا، اس کے اطراف مستحکم حصار تعمیر کرایا اور برج بنوائے۔  
ایوان عام میں ترمیم کی اور تین ہزار آدمیوں کی نشستوں کا انتظام کیا۔  
ابن سعود کا محافظ دستہ بہت زبردست تھا، اس میں نجد کے  
منتخب جنگجو اور نومذہبی غلام تھے۔ ان کا لباس سفید تھا، ہاتھ میں  
طفیجہ اور چاندی کے دستہ کی تلوار ہوتی تھی۔ محافظ دستہ کے  
یہ سپاہی ہر وقت احکامات کی تعمیل کے لیے تیار رہتے تھے، محل میں  
انہی کا راج تھا۔

ابن سعود کی زندگی سادگی کا بہترین نمونہ تھی اور وہ حتی الوسع  
اپنے آپ کو تکلفات اور بیجا اخراجات سے دور رکھتا تھا تاہم  
ضرورت مندوں کو خیرات دینا اور مہالوں کو حتی المقدور عمدہ سے  
عمدہ تحائف دینا اس کا دستور تھا۔ محتاط تھا مگر فیاض۔ ایک مرتبہ  
اس کے ایک ماتحت نے اس کی فیاضیوں پر اعتراض کیا تو ابن سعود  
نے جواب دیا۔

”رقم جمع کرنے کے لیے خزانہ بنانا، نہ میرا دستور رہا ہے اور نہ میرے اجداد کا۔ جمع شدہ رقم فضول ہوتی ہے، دوسرے بادشاہوں کی کروڑوں کی دولت کس کام آئی؟“

ایک دوسرے معترض کو بھی اس نے اسی طرح کا دندان شکن جواب دیا۔

”جہاں ہم بوئینگے وہیں سے کاٹ بھی سکتے، امن اور خوش حالی کے زمانہ میں اگر میں فرار دلی سے بچ لوؤنگا تو جنگ اور مصیبت کے زمانہ میں اچھی فصل بھی کاٹ سکونگا۔ امن کے زمانہ میں تو میں ہاتھ نہیں روکوؤنگا اور اگر کسی کو میری عبا کی بھی ضرورت ہو تو اس کے دینے میں بھی مجھے کوئی تال نہیں۔ جنگ کے زمانہ میں جب میں طلب کروؤنگا تو میری رعایا اپنی جان و مال سے مدد کرنے میں ذرا بھی دریغ نہ کریگی۔“

ابن سود کو اسی طرح اپنے خاندان پر بھی بہت ناز تھا، افراد خاندان کے ساتھ وہ نہایت اچھا سلوک کرتا تھا اور اس امر کا کافی خیال رکھتا تھا کہ کسی کی حق تلفی نہ ہونے پائے۔ سعد کے انتقال کے بعد اس نے اس کی بیوہ سے عقد کر لیا اور اس کے بچوں کی پرورش بالکلیہ اپنے ذمہ کر لی۔ بیویوں کے ساتھ اس کا سلوک حد درجہ مساوی تھا، سب ہر طرح سے خوش تھے۔ ابن سود اپنے والد کا حد درجہ احترام کرتا اور ضروری اور نازک مسائل میں اس کے نیک مشورے

لے کر ان پر عمل کرتا تھا۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود تمام بڑے آدمیوں کی طرح وہ بھی کسی قدر خیالی تھا، جب خوش ہوتا تو دل بھر کر ہنستا بولتا اور ساتھیوں کی غلطیوں کو نظر انداز کر جاتا لیکن اگر ذرا آزدہ ہوتا تو پھر تنکا بھی اس کی آنکھوں میں شہتیر بن کر کھٹکتا اور وہ غصہ کے مارے کانپنے لگتا۔ لیکن ساتھ ہی اس کے اس کا غصہ دیر پا نہ تھا بلکہ بہت جلد اُتر جاتا تھا۔ اگر بعد میں معلوم ہو جائے کہ غلطی خود اس کی تھی تو وہ فوراً اس کا اعتراف کرتا اور اگر اس سلسلہ میں اس کی طرف سے کسی کو نقصان پہنچتا تو اس کی تلافی کر دیتا۔

ایک مرتبہ اس کے ایک خاص غلام نے کچھ غلطی کی، اس نے حکم دے دیا کہ وہ عین دوپہر کے وقت برسہنہ پیر سیدھے ہفوف چلا جائے۔ غلام نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ دراصل غلام چھوڑ تھا تو فوراً اس نے ہفوف کی طرف تیز رفتار ساندھی سوار روانہ کیے تاکہ وہ جلد اسے واپس بلا لائیں۔ جب غلام واپس آیا تو اسے اپنے بازو بٹھلا کر باتیں کیں اور پھر اسے گھر جانے کا حکم دیا۔ جب یہ غلام گھر پہنچا تو ایک حسین اور جمیل لونڈی اس کی منتظر تھی۔ یہ ابن سوہو کا انعام تھا۔ جلوی کا بیٹا، فہاد بڑا لڑاکو اور سر پھرا تھا۔ ایک دفعہ اس نے شاہی محافظ دستہ کے ایک سپاہی کو مار دیا۔ ابن سوہو نے فوراً اسے طلب کیا اور اپنے چابک سے خوب پیٹ کر خمیہ کے باہر ڈھکیل دیا۔

ابن سعود کے علماء میں سے ایک نے الاخوان کی جماعت والوں کے ساتھ بدسلوکی کی۔ ابن سعود نے اس عالم سے جواب طلب کیا۔ اس نے کچھ بے ادبی کی، اس پر ابن سعود نے اسے اپنے ملازمین کے ذریعہ سے کمرہ کے باہر نکلوا دیا اور حکم دیا کہ عام آدمیوں کی طرح اسے بھی ایک ہفتہ کی قید تنہائی دی جائے۔

بہر حال ابن سعود اگلے کو لو لاکا تھا لیکن اسے غصہ جتنا جلد آتا تھا اتنا ہی جلد تر بھی جاتا تھا۔ اس کی اصل وجہ غذا کی بے اعتدالی تھی۔ ابن سعود بہت کم سخت بیمار پڑا، البتہ گھٹیا بیجار اور فساد جگر کا لگاؤ ہمیشہ ہی رہا۔ مگر وہ اس کی ذری بھی پرواہ نہ کرتا تھا اور جو ملے اور جتنا ملے کھا لیتا تھا۔ رمضان میں افطار کے بعد جی بھر کر میوے کھاتا اور دل کھول کر پانی پیتا تھا۔ کھانا بہت تیزی سے کھاتا اور کھاتے ہی کام کرنے بیٹھ جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے اعصاب قابو میں نہ رہ سکے اور جذبات پر اس کا مضراثر پڑا۔

ہر بڑے آدمی کی طرح ابن سعود بھی بحث و مباحثہ سے خاص دلچسپی رکھتا تھا اور انہی مباحثوں سے وہ اہم اور سودمند نتائج بھی اخذ کرتا تھا۔ بحث و مباحثہ اس کے اوقات فرصت کا شغل تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد اپنا اجلاس کرتا اس کے بعد کچھ دیر کے لیے حرم میں جا کر پھر اپنے دوست احباب اور جہانوں کے ساتھ بیٹھ کر ان سے مختلف عنوانات۔ گھوڑے، اونٹ، شکار، جنگ، مذہبی مسائل وغیرہ پر

مختلک کرتا تھا۔ اگر کوئی باہر والا ریاض آتا تو پھر اس کی دلچسپی کا سامان اور  
 بڑھ جاتا اور وہ اسے دعوت دے کر بیرونی دنیا کے دانتھات دلچسپی کے  
 ساتھ سنا کرتا تھا۔

ابن سعود رات کا راجہ تھا، تمام دن کالم کرنے کے بعد بھی وہ راتوں  
 کو بہت دیر تک جاگتا تھا۔ اس کے ساتھی نیند کے مارے غوطے لگاتے،  
 جمائیاں لیتے اور یہ چار اور قہوہ پیتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتے  
 رہتا جب کوئی شخص بالکل غافل ہو جاتا تو اسے اس طرح جگاتا۔  
 ”ہاں یافعی! تو پھر اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟“ یہ شخص چونک  
 جاتا اور سنبھل کر بیٹھتا۔ اس پر ابن سعود مسکرا دیتا۔ یہی اس کا مذاق تھا!

(۲)

۱۹۱۵ء میں ابن سعود کی حکومت نجد پر مستحکم ہو گئی، اور بیرونی ممالک  
 خصوصاً جرمنوں اور انگریزوں کے پاس اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔  
 لیکن ہمایہ قبائل سے اس کے تعلقات کسی قدر پیچیدہ ہو گئے۔ رشیدی  
 فی الوقت خاموش بیٹھے اطمینان کے ساتھ ترکوں سے تجارت کر رہے تھے۔  
 رشیدیوں نے سلیم سے ساز باز کر لی اور خفیہ طور پر کویت سے سامان لگا کر  
 دمشق میں رہنے والے ترکوں کے پاس بھیجتے رہے۔ اس طرح ان دونوں  
 تینوں میں ایک طرح کا ایک ہو گیا تھا۔ ابن سعود کو سلیم سے سخت دشمنی  
 تھی، مجانیوں کا ساتھ دے کر عین وقت پر جو اس نے دغا کی اس کا داغ  
 ابھی اس کے دل سے مٹا نہ تھا، وہ چاہتا تھا کہ سلیم کو کویت سے نکال کر

وہاں بھی اپنی حکومت قائم کر لے۔ ابن سعود نے اس کی تجارت میں روڑے  
 اٹکانے کی کوشش کی، اس پر سلیم نے عجمانیوں کو ابھارا کہ وہ نجد میں بغاوت  
 پھیلائیں۔ اور خود ابن سعود کے چند آدمیوں کو جو کسی کام سے کویت گئے  
 ہوئے تھے اپنے پاس قید کر لیا۔ اس طرح ان دونوں میں کھلی مخالفت ہو گئی۔  
 اسی کے ساتھ ابن سعود اور حسین میں تن گئی۔ جب انگریزوں نے  
 ترکوں کو بھگا دیا تو حسین کا اثر بڑھ گیا اور وہ اپنے کو در ممالک عرب کا  
 شہنشاہ، جلالے لگا اور ابن سعود کو بھی لکھ بھیجا کہ وہ اس کی حکومت کو  
 تسلیم کرے اور قبائل عتیبہ پر سے اپنا تسلط اٹھالے۔ ابن سعود اس  
 خط کو پڑھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ لیکن وقت ایسا نازک تھا کہ فوراً اس کا  
 جواب، جنگ سے نہ دے سکا کیونکہ اب اسے دو قوتوں سے نبٹنا تھا،  
 ایک سلیم، دوسرے حسین۔ اسی لیے اس نے وہابی ملاؤں کو عتیبہ روانہ کیا  
 کہ وہ آل عتیبہ کو حسین کے خلاف اچھی طرح سے آمادہ کریں۔ ملاؤں کو اس  
 میں کامیابی ہوئی، خرماء کا سردار لوری کی حسین سے پہلے ہی ناچاقتی ہو چکی  
 تھی، قبائل پر اس کا اچھا اثر تھا، اس نے ان کو حسین کے خلاف بہت  
 جلد بھر کا دیا اور حسین کے نمائندے کو نکال کر ابن سعود کی سیادت  
 قبول کر لی۔

خرما مشہور، زرخیز اور تجارتی شہر تھا، یہاں نجد کے بدوی صحابی  
 تاجروں سے لوٹن اور بکرے تبادلو کرنے کے لیے آتے تھے۔ اس طرح  
 سے یہ حجاز کی گنجی تھی، علاوہ ازیں حجاز کو جانے والی سڑکیں بھی ادھر سے

تھیں مجددہ کے لیے بھی یہی راستہ تھا، مکہ اور طائف کو بھی اسی سے گزر کر جانا پڑتا تھا۔ حسین کسی قیمت پر بھی اس شہر کو اپنے دشمنوں کے حوالہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے فوراً آٹھ سو سپاہیوں کو اسے واپس لینے کے لیے روانہ کیا۔ خرمہ کے باشندے بڑے بہادر تھے، انہوں نے چاروں طرف سے حسین کے سپاہیوں کو گھیر لیا اور خوب مار پیٹ کر کے بھگا دیا۔

تمام نجد میں ایک دھوم مچ گئی اور بچہ بچہ حسین کا مخالف ہو گیا۔ ”شریف حسین ہی ہمارا دشمن ہے، وہ بے دین ہے، رکتی سبکی کی بات ہے کہ وہ مقامات مقدسہ کا دالی ہے، وہ باغی اور غاصب ہے۔ یہ بڑے غضب کی بات ہوگی کہ ہم سچے مسلمانوں پر حملہ کر کے بغیر سزا پائے چلا جائے اے عبدالعزیز! اللہ اور ہماری رہبری کر“ ابن سعود نے جواب دیا ”ہاں یہ سچ ہے، حسین اور مکہ والے مشرک ہوتے جا رہے ہیں..... لیکن امود سلطنت کا لحاظ کر کے مجھے کچھ انتظار کرنا چاہیے۔“

( ۳ )

ابن سعود کی غیرت، اس کی خواہش اور رعایا کا اصرار اسے حسین پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کر رہا تھا لیکن قلبی کی وجہ سے مجبور تھا کیونکہ اس سے غیر جانبداری کا وعدہ ہو چکا تھا اور حسین بھی انگریزوں کا حلیف تھا، انگریزوں نے بجائے حسین کے ابن رشید پر حملہ کرنے کی صلاح دی کیونکہ وہ ترکوں کا حلیف تھا، اسی طرح سے بل سہنے دن نے دمشق پر دھاوا



بولنے کا مشورہ دیا۔ لیکن ابن سعود اتنا غیر سنجیدہ تو نہ تھا جو ان کی باتوں میں آجاتا۔ وہ اپنی حدود سے اچھی طرح واقف تھا۔ کچھ جواب دینے کی بجائے وہ خاموشی کے ساتھ سوچتا رہا، تمام گریما کا زمانہ اسی الجھن میں گھاٹا اور کچھ طے نہ کر سکا۔ کیونکہ اگر حسین پر حملہ کرتا تو انگریزوں سے معاہدہ ٹوٹ جاتا، اور انگریز دشمن ہو جاتے، وہ خواہ مخواہ انگریزوں کو اپنا دشمن بنانا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ ترک نزع کی حالت میں ہیں اور جنگ عظیم میں انگریزوں کو فتح ہونی بدیہی ہے۔

وہ اسی الجھن میں تھا کہ حسین نے خرماء پر ایک دفعہ اور چڑھائی کر رکھی لیکن اس دفعہ بھی اسے شکست ہوئی، لڑی نے ابن سعود سے امداد طلب کی لیکن ابن سعود اپنی فوج نہ بھیج سکا بلکہ اس نے حسین کو ایک خط لکھ بھیجا۔ حسین نے اس خط کو بغیر کھولے تھارتے واپس کر دیا اور قاصد سے کہا کہ وہ ابن سعود سے جا کر کہہ دے کہ حسین، تمام عرب ممالک کا شہنشاہ، غفر رب ریاض پر حملہ کر کے مشرکین کا منہ کالا کرنے والا ہے۔

ریاض میں چھ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ہر شخص حسین کے خلاف تیار تھا، عبدالرحمن، مشیران سلطنت، علماء، شیوخ اور الاخوان سب کے سب حسین پر حملہ کرنے کے لیے ابن سعود کو مجبور کر رہے تھے مگر انگریز اسے برابر روکے جا رہے تھے۔ انگریز اس وقت ایک زبردست چال چل رہے تھے، ابن سعود کا زور گھٹانے کے لیے ادھر ترانہوں نے اس سے معاہدہ کر لیا اور ادھر حسین کو روپیہ بھرنے لگے۔ اس طرف رشید پر

حملہ کرنے کی صلاح دی۔ اُس طرف سلیم کے ذریعہ اسے مدد پہنچائی۔  
ابن سعود اس چال کو سمجھ نہ سکا اور اپنے معاہدہ کی پابندی میں نقصان  
نقصان اٹھاتا گیا۔

بالآخر ابن سعود کا پیانہ صبر لبریز ہو چکا۔ وہ اس جنجال سے سخت  
ناراض تھا۔ ایک موقع پر فلبی سے خوب بحث ہو گئی، ابن سعود بے صبری  
کے ساتھ زمین پر لکڑی مار مار کر کہنے لگا۔

”واللہ، میں ان فضول باتوں سے اپنے آپ کو دق کرنا نہیں  
چاہتا۔ مجھے حق ہے کہ اس سرزمین پر خدا کے خوف سے مرتے دم تک  
حکومت کروں“

یہی اس کا فلسفہ زندگی تھا۔

فلبی ابن سعود کو ہمیشہ حین کی مخالفت سے روکتا رہا بلکہ ہر دفعہ  
رشیدیوں پر حملہ کرنے کی صلاح دی۔ ایک دفعہ ابن سعود نے تنگ آکر فلبی  
سے کہا۔

”جو طرف سے انگریزوں کے حلیف مجھے دھکیاں دے رہے ہیں۔  
خدا ان کو دیکھے۔ میں بھی انگریزوں کا حلیف ہوں، پھر بھی وہ مجھے دھکی  
دیے جا رہے ہیں، لیکن فلبی یاد رکھو، اگر انگریزوں نے میری حفاظت  
نہ کی تو کوئی پرواہ نہیں، میں ان کے حلیفوں سے خود بٹ لوں گا۔“  
اس اثناء میں ابن سعود کی صحت کچھ جواب دے چکی، اس کی خود  
اعتمادی اور جوش میں بھی ذری سی کمی ہو گئی۔ عوام میں کسی قدر بددلی

پھیل گئی کہ ابن سعود کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے۔ حسین نے ایک مرتبہ اور خرابا پر چڑھائی کی لیکن فوج اس دفعہ بھی اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔ حسین خرابا کو فتح کرنے کے لیے ایک زبردست فوج روانہ کرنے کی تیاری کرنے لگا۔ خرابا کی رعایا نے اس کے پاس سلسل یہ پیغام بھیجے لیکن سب لاکھ حاصل آخریں انہوں نے مجبور ہو کر طغزیہ انداز میں یہ لکھ بھیجا۔

”اے عبدالعزیز، اگر تجھے دنیا کی دولت جمع کرنے کی خواہش ہے اور تو اسی لیے ہماری امداد کو نہیں آنا چاہتا تو ہمیں صاف صاف کہہ دے۔ ہم تجھے معاف کرتے ہیں۔ ہم نے تیری امداد کے لیے ہمیشہ اپنے آدمی روانہ کیے لیکن ہمیں اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔ اب کی دفعہ ہم عورتوں کو روانہ کریں گے تاکہ تجھیوں کو عبرت دلا کر وہ ہماری امداد کے لیے آمادہ کر سکیں۔“

جب اس خط کا حال نجدیوں کو معلوم ہوا تو ان کے غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایک طوفان برپا ہو گیا۔ علمائے عام جلسوں میں ابن سعود پر اعتراضات کی بوچھاڑ کرنی شروع کر دی، ریاض کے بلند پایہ پیشینہ شیخ عبدالوہاب نے ابن سعود پر یہ الزام لگایا کہ وہ اسلام سے بہت کر مسلمانوں کو نظر انداز کر رہا ہے، انگریزوں کا دوست ہے اور جیسا کہ خرابا والوں نے لکھ بھیجا وہ ہمیں تباہ و برباد کر کے اپنا خزانہ بھرنا چاہتا ہے۔ دہائی نہیں چاہتے تھے کہ انگریزان کے ملک میں آکر رہیں۔ اب تو وہ اور بگڑے حتیٰ کہ ملازمین نے بھی مقاطعہ شروع کر دیا۔ دولیش نے

”الاخوان“ کو جنگ کے لیے تیار کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ اگر ابن سعود کو جنگ میں کچھ تال ہے تو پھر ہم خود حسین کو دیکھ لینگے، خرماء والوں کی مدد کریں گے اور مکہ پر قبضہ جائیں گے۔ اسی دوران میں اطلاع آئی کہ حسین، رشید اور سلیم سے اتحاد کر کے متفقہ طور پر نجد پر حملہ کرنا چاہتا ہے، سلیم عجانیوں سے مل رہا ہے اور رشیدی قبائل شمر کو لالچ دے کر اپنا ہم نوا بنا رہے ہیں۔

— (۴) —

ان حالات نے ابن سعود کی آنکھیں کھول دیں اور اس نے فوراً جنگ کا تصفیہ کر لیا۔ کسی قطعی فیصلہ پر نہ پہنچنے کے باعث، زندگی اس پر ہار گذر رہی تھی اور اسی بوجھ سے وہ دبا جا رہا تھا، لیکن جب اس نے دل میں تصفیہ کر لیا تو اسے کیسوئی ہو گئی اور اب پھر وہ

پہلے کا ابن سعود تھا

ابن سعود نے اس جوش میں عقلمندی کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اس نے انگریزوں سے اسی طرح دوستی قائم رکھی بلکہ ان سے وعدہ لیا کہ سلیم اور حسین کو اس پر حملہ کرنے سے روکیں۔ اس کے بعد اپنے بیٹے ترکی کو دوش کی معیت میں قبیلہ شمر پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔ علماء دینی الحال رشیدیوں پر حملہ کرنے کے مخالف تھے اور حسین کو اس کے کروت کا جواب دینا ضروری سمجھتے تھے۔ ابن سعود نے ان کی تشفی کے لیے علماء کی تفہیم کی اور بتلایا کہ رشیدی اہل نجد کے دشمن ہیں، پہلے بھی وہ مخالف تھے اور اب بھی مخالف ہیں، ترکوں سے

ان کی خاصی دوستی ہے، وہ دامنے، درے، قدمے اور سنے ان کی امداد کر رہے ہیں، قبیلہ شمر ہر طرح سے تیار ہے، انہیں صرف ترکی فوج کا انتظار ہے، ورنہ وہ کبھی کے ریاض پر حملہ کر دے ہوتے۔ ایسے وقت میں ان پر حملہ نہ کرنا اصولی غلطی ہے۔ رہا حسین اور سلیم کا معاملہ، وہ بعد کو دیکھا جائیگا، فی الوقت ان سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں کیونکہ انگریزوں کے ذریعہ اس کا بندوبست کر دیا جا چکا ہے۔ رشید کو سے بننے کے بعد حسین اور سلیم کو سزا دینا کوئی بڑی بات نہیں۔

ابن سعود کا یہ استدلال علماء کے لیے تشفی بخش تھا، اس کے بعد ابن سعود نے قبائل کے سرداروں کے پاس کہلا بھیجا کہ سب کے سب شہر شقرا کے پاس جمع ہو جائیں۔ ہر شخص جنگ کے لیے تیار ہوا تھا، خوشی خوشی سب جمع ہوئے، اس کے بعد ابن سعود اپنے محافظ دست کے ہمراہ اس مقام پر پہنچا اور کہا کہ جنگ ابن رشید اور آل شمر سے ہے۔ یہ سن کر سب لوگ حیران رہ گئے۔ وہ حسین، سلیم اور عجمانیوں کے خون کے پیاسے تھے اور اسی فرض سے آئے بھی تھے۔ ”الاخوان“ بھی اس بات سے ناراض تھے، قبیلہ مطیر کے شیخ الدویش نے نمائندہ کی حیثیت سے سامنے آکر ابن سعود سے کھلے الفاظ میں کہا

”ہم حسین یا عجمانیوں سے جنگ چاہتے ہیں، انگریز اسے مدد دے رہے ہیں جس سے ہماری اخوت کو دھکیل پیچ رہا ہے، ہم تو اپنے مذہب کے مخالفین سے جنگ چاہتے ہیں۔ اگر راضی ہو تو بولو۔ ہم

پہلے حسین کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں یا آل عثمان کے؟“

ابن سعود نے بہت ہی سنجیدگی اور خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سنیں۔ وہ ان کے دلوں کی حالت سے خوب واقف تھا، وہ یہ شبہ کر رہے تھے کہ ابن سعود کافروں سے مل کر ان کے اشاروں پر چل رہا ہے۔ اب ابن سعود بڑی مشکل میں تھا، گو یہ مشکل وگرنہ گویا مشکل سر جھکا کر وہ ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اگر الاخوان ذرا ابھی بدل گیا تو وہ دوشیز کی سرکردگی میں حسین پر حملہ کر بیٹھیں گے۔ دوشیز بڑا چال باز تھا اور الاخوان کی قوت اب کافی زبردست ہو چکی تھی۔ ان سے مخالفت کرنا اپنے اثر کو اپنے ہاتھ سے زائل کرنا تھا۔

بہر حال ابن سعود نہایت متانت کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور دائرہ صحریٰ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک ہاتھ کو آگے بڑھا کر گرجتی ہوئی آواز میں ان سے مخاطب ہوا۔ اپنے قبائل کی نفسیات سے وہ خوب واقف تھا، ان کو اکسانا، ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا اور پھر تیز ہو کر ڈانٹ دینا، یہ سب اس کے چلتے ہوئے گزرتے۔ اپنی آواز کو آہستہ آہستہ اٹھاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔

”دیکھو، تم میرے سپاہی ہو، سوائے خدا کی قوت کے تمہارے اور میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ یہ نہ خیال کرنا کہ میں ان امور سے بے خبر ہوں جن کی ہمیں ضرورت ہے، اور رہا شریف حسین کا، تم اس کے متعلق زیادہ فکر نہ کرو، اگر نزلے سے خرابا پر حملہ کرنے سے باز رکھیں گے

یا۔ ہاں میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں خود اس کے خلاف حملہ کروں گا۔ اس کی فکر نہ کرو۔ اگر میں اپنے خاندان کے کسی رکن یا ایک غلام ہی کو بھیج دوں تو سارا جنوبی علاقہ شریف کے خلاف اٹھ کھڑا ہو جائیگا۔ اور اب رہا عجمانیوں کے متعلق، تو تم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے اور جو یہ کہتے ہو کہ انگریز اسے مدد پہنچا رہے ہیں، اگر یہ ہے تو پھر انگریز مجھے یہ کیوں کہتے ہیں تم نادان ہو، تمہارے پاس ذرائع موجود ہیں، ابھی حائل پر حملہ کر دو؟

”وہ درست کہتے ہیں، میرے پاس حملہ کرنے کے لیے وسائل موجود ہیں اور ان کے باوجود میں قائل کر رہا ہوں۔ اگر میں حائل پر قبضہ کر لوں تو پھر عجمانی کیا چیز ہیں! اگر میں حاکم ہو جاؤں تو انگریز تمام ریگستانی قبائل کو میری ہی نگرانی میں چھوڑ دینگے اور ہماری سرزمین پر جو لوگ بستے ہیں، ان سے ہمیں کوئی خطرہ نہ رہیگا“

اس کے بعد جب یہ لوگ رام ہوتے نظر آئے تو ابن سود نے بتلایا کہ مذہب کے دشمن تو رشیدی ہیں، علماء نے بالاتفاق یہ بات تسلیم کر لی۔ الاخوان جو کچھ دیر پہلے شبہ میں بھرے ہوئے بیٹھے تھے، اب صاف ہو گئے اور جوش میں آکر کہنے لگے۔

”اے عبدالعزیز تو نے ہم پر اس سے پہلے ہی بھروسہ کیوں نہیں کیا، بلا شک و شبہ ہم تیرے ہی لیے لڑتے“

اس طرح پھرست آیا۔ مرتبہ ابن سود ان کا قابل اعتماد رہبر

بن گیا۔ اہل قبائل اس کے خیمہ کی اطراف جمع ہو کر اس کے ہاتھ کو بوسہ دیتے لگے۔ شام کو سب لوگ ایک جگہ نماز کے لیے جمع ہوئے، ابن سعود نے امامت کی، اس کے بازو ایک حبشی غلام برہنہ تلوار لیے گھڑا تھا تاکہ کوئی دشمن اچانک حملہ نہ کر بیٹھے۔ نماز ختم ہونے پر ابن سعود نے کہا۔ ”ہر شخص اپنے گھر چلا جائے، جنگ کے لیے جلدی سے تیار ہو جاؤ“ اور اپنے گھروں میں سب چیزیں ٹھیک کر کے چاند رات کو مجھ سے بریدہ پر لو، خدا مہربان ہے، وہ ہمیں کامیاب کرے گا“

ایک ماہ بعد ابن سعود نے حائل کا رخ کیا۔ مخبروں نے اطلاع دی کہ اس وقت رشیدی موافقت کے لیے بالکل تیار نہیں ہیں۔ یہ سن کر ابن سعود نے آگے بڑھنا شروع کیا، رستہ میں بنی یطرف کے قبائل تھے، یہ لوگ رشیدیوں کے وفادار دوست اور ہذاستہ خود بڑے بہادر تھے، انہوں نے ابن سعود کو آگے بڑھنے سے روکنا چاہا لیکن اس کی منظمہ فوج نے انہیں پسپا کر دیا۔ اس درمیانی جھگڑے میں جو وقت لگا اس عرصہ میں ابن سعود کی چڑھائی کی اطلاع رشید کو پہنچی اور وہ قلعہ بند ہو کر محاصرہ کے لیے تیار ہو گیا۔

ابن سعود محاصرہ کو فضول سمجھتا تھا اس کے ساتھی بھی جنگ کے لیے بے چین تھے۔ ایسے میں رشیدیوں نے صلح کی درخواست کی۔ ابن سعود نے اسے قبول کر لیا اور بنی یطرف سے بہت کچھ مال غنیمت حاصل کر کے خوش خوش گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس چڑھائی سے



---

رشیدیوں اور ترکوں پر خاصہ اثر ہوا، انگریز بھی خوش ہوئے، سلیم کو  
بھی بلا واسطہ ایک دھکی ہو گئی اور اہل نجد اور الاخوان دونوں خوش  
ہو گئے۔ ابن سعود کی یہ دہ سیاسی چال تھی جس کو دیکھ کر آج کے  
زمانہ کے بڑے بڑے سیاست دان گنگ ہیں۔

# دسواں باب

## حسین کی شکست

۱

جب ابن سعود سائل سے ریاض کی طرف لوٹ رہا تھا، فلسطین میں  
النبی اور بندہ او میں ناؤ ترکوں کی منتشر قوج کو بھگا رہے تھے۔ یہ قوج اور  
انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ ترک بری طرح پسپا ہوئے۔ بلغاریہ اور  
ترکی نے صلح کی درخواست کی۔ آسٹریا نے بھی یہی کیا۔ جرمنی کی سلطنت  
خراب ہو گئی اس طرح جنگ عظیم کا خاتمہ ہو چکا۔

اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں انقلوئنا شروع ہوا، یہ زیادہ تر جنگ عظیم  
کا نتیجہ تھا، زہریلی گیسوں، سڑے مردوں اور طرح طرح کی بدخواہیوں  
کی تحت انقلوئنا ساری دنیا میں پھیل گیا۔ ملک عرب بھی اس سے  
بچ سکا۔ ریاض میں اس کا زور بہت رہا۔ کوئی گھر ایسا نہ تھا جس سے

کوئی مردہ نہ بھلا ہو۔ بخدا کا ولی عہد ترکی، جو ایک بہادر اور مضبوط دلالتھا، اسی مرض نخوس کا شکار بنا۔ شاہی حرم میں ابن سعود کی محبوب ملکہ جوہرہ کا بھی انتقال ہو گیا۔

تمام ریاض اپنے مرحوموں پر خون کے آنسو بہا رہا تھا، ابن سعود بھی ان کے ساتھ اپنے غم میں مبتلا تھا، یوں تو اس کی اور بیویاں تھیں لیکن جوہرہ کو وہ سب سے زیادہ چاہتا تھا، یہ سعودی خاندان کی ایک شہزادی تھی۔ عام عورتوں کے مقابلہ میں وہ بہت ہی حسین اور ذہین تھی۔ ابن سعود کو اس سے بے حد محبت تھی۔ ایک دفعہ کسی بات پر دونوں میں جھگڑا ہو گیا، دو دن تک دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ رہے۔ ابن سعود کو یہ قلیل مدت بھی شاق گزری۔ وہ کسی طرح اس سے علیحدہ نہیں رہ سکتا ہے، جوہرہ کے بغیر اس کی زندگی تلخ تھی۔

ابن سعود نے کئی شادیاں کیں لیکن ان کی تعداد کبھی شرعی احکامات کے دائرہ سے باہر نہیں ہوئی چنانچہ وہ کہا کرتا تھا۔

”میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات کی سختی کے ساتھ پابندی کرتا ہوں اور جو حکم ہے اس پر عمل کرتا ہوں۔۔۔۔۔ میں نے اپنی بیویوں کی تعداد کو کبھی حد شرعی سے متجاوز ہونے نہ دیا“

۱۹۱۶ء میں ایک دفعہ دوران گفتگو میں اس نے بلجیہ وں سے سخت تعجب کے ساتھ پوچھا؛

”اٹکستان اس قدر روشن خیال ہونے کے باوجود وہاں رونا  
کنے لیے سزا نہیں۔ اس ریگستان میں تو اس کے لیے سنگ باری  
کی جاتی ہے“

بل سے ون نے دریافت کیا  
”آپ کے حرم میں کتنی عورتیں ہیں؟“  
ابن سعود نے جواب دیا۔

”میں سرکارِ دو عالم کے حکم کے مطابق چار بیویاں رکھتا ہوں“  
”لیکن کتنی عورتوں سے عقد کیا اور کتنوں کو طلاق دی؟“  
”میں نے کوئی تلو کے قریب عورتوں سے عقد کیا اور طلاق  
بھی دی، اگر خدا چاہے تو اور کئی شادیاں کر کے طلاق دوں گا“  
ایک دوسرے موقع پر ابن سعود نے قلبی سے شادی اور طلاق  
کے مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا۔

”واللہ میں نے اپنی زندگی میں کئی شادیاں کیں، اور خدا کے  
فضل سے اب تک شادیاں کرتا ہوں۔ میں ابھی نوجوان اور مضبوط  
ہوں۔ اب جنگ کے نقصانات کے بعد یقیناً ایک وقت آئیگا جبکہ  
یورپ کے لوگ سیکھینگے اور ہر مرد کئی شادیاں کرنے لگیگا“

ابن سعود شریعتِ محمدی کا سختی کے ساتھ پابند تھا اور لوگوں سے  
بھی اس کی پابندی کرواتا تھا۔ اس کے حرم میں ہمیشہ تین بیویاں ہتی  
تھیں۔ جب جی چاہتا خالی جگہ کو بڑھ کر لیتا، لیکن اس کے باوجود اپنی

بیویوں کے ساتھ اس کا سلوک حدودِ رساویانہ تھا۔ کسی کو ذری بھی نہ تھا۔  
 رتھی۔ عشاء کی نماز کے بعد وہ حرم میں جاتا اور سب سے مساویانہ  
 طور پر ملتا تھا۔

عام طور سے لوگ ابن سود پر عیاشی کا الزام دیتے ہیں، یہ غلطی  
 ہے۔ بلاشبہ ابن سود نے کئی شادیاں کیں لیکن اس کے کئی وجوہ تھے اس نے  
 مختلف قبائل کے سرداروں کی لڑکیوں سے اس لیے عقد کیا کہ ان سے  
 قطعاً مضبوط ہو جائیں۔ عبدالوہاب کے خاندان کی لڑکی سے شادی  
 کرنے کی غایت مذہبی پیشواؤں کو خوش کرنا تھا۔ اسی طرح اس کی شادیوں  
 کی تعداد زیادہ ہو گئی۔ طلاق کی تعداد بھی اسی کے لگ بھگ مذہبی  
 یہاں یہ خیال ہو سکتا ہے کہ طلاق دینے سے عام بددلی پیدا ہو گئی ہوگی  
 لیکن عرب میں طلاق دینا کوئی مذموم فعل نہیں سمجھا جاتا بلکہ عرب  
 ابن سود کو اپنی لڑکی دینا فخر سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ مطلقہ عورتوں کے  
 ساتھ اس کا سلوک نہایت اچھا ہوتا تھا، وہ نہ صرف ان کی روپیہ پیسہ  
 سے امداد کرتا بلکہ ان کے لیے اچھے شوہر بھی فراہم کر دیتا تھا، اگر ان کے  
 بطن سے کوئی اولاد ہوتی تو اس کی نگرانی کا فہمہ وار خود ہوتا تھا۔  
 اس طرح سے ابن سود نے کئی شادیاں کیں، کبھی اپنی خواہشات  
 کی تکمیل کے لیے، کبھی قبائل سے اتحاد پیدا کرنے اور کبھی کسی غریب مگر  
 شریف خاندان کو ترقی دینے کے واسطے۔ لیکن ان سب میں وہ جوہرہ  
 کو بہت چاہتا تھا، ترکی اور جوہرہ کی موت اس کے لیے ایک سانحہ عظیم

تھی۔ ایک سال تک وہ اسی غم و اندوہ میں مبتلا رہا۔ محل میں اس نے جوہرہ کے کمروں کو بند کر دیا اور جہاں کی چیزیں وہیں رکھی گئیں۔ ابن کمروں میں سوئے فوری کے کسی دوسری حدت کو داخلہ کی اجازت نہ تھی۔ ابن سود نے جوہرہ کے ملازموں اور غلاموں کو اپنے پاس رکھ لیا، ان کے ساتھ اس کا برتاؤ اتنا عمدہ تھا کہ وہ اپنی ملکہ کا رنج بھول گئے۔ جبکہ دن ابن سود، فجر کی نماز کے بعد، ریاض کے بڑے قبرستان کو فاتحہ کے لیے جاتا تھا جہاں جوہرہ دفن تھی۔

(۲)

ابن سود کا غم ابھی پوری طرح غلط نہ ہونے پایا تھا کہ اسے جنگ کے لیے فوراً تیار ہونا پڑا۔ حسین کا بیٹا، عبداللہ خرمی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابن سود نے اس دفعہ خرمی کی طرف داری کا تہیہ کر لیا کیونکہ سقراء پر اس نے وعدہ کیا تھا کہ اگر اب کی دفعہ خرمی پر حملہ ہوا تو وہ ان لوگوں کی تائید کرے گا۔ اس مرتبہ ابن سود کو دافعت یا مقابلہ کے لیے زیادہ جدت کرنی نہیں پڑی کیونکہ اہل عرب حسین کے سخت مخالف ہو گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس نے عرب کو انگریزوں کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اس لیے قبائل جوق در جوق اس کی امداد کو آنے لگے۔

اب حسین اور ابن سود دونوں ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔ حسین نے کھلم کھلا جنگ کی تیاری شروع کر دی لیکن ابن سود نہایت خاموشی سے اپنا کام کرتا گیا تاکہ حسین مغالطہ میں رہے۔ انگریزوں نے

حرب کے حالات پر غور کرنے کے لیے قاہرہ میں ایک کانفرنس منعقد کی  
 حسین جنگ کے زمانہ میں ان کا یار و وفادار تھا، صلح کے زمانہ میں بھی  
 وہ ویسا ہی رہا، انگریز ابن سعود کو اتنا اہم نہیں سمجھتے تھے، ان کے نزدیک  
 اس کی حیثیت ایک یا اثر شیخ کی تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے خیال  
 کیا کہ ابن سعود کو متشین گن، رافل، انگریزی باقاعدہ فوج وغیرہ سے آسانی  
 کے ساتھ شکست دی جاسکتی ہے اس خیال سے کانفرنس نے حسین کو  
 امداد دینے کا تصفیہ کیا اور ساتھ ہی ابن سعود کو حکم دیا کہ وہ واپس  
 چلا جائے اور خرماسین کو واپس کر دے ورنہ امداد بند کر دی جائیگی۔  
 اس ٹھکانہ انداز سے ابن سعود کی غیرت کو ٹھیس لگی، وہ محض اپنے  
 وعدہ کی بناء پر انگریزوں سے ملا ہوا تھا اور حسین پر حملہ نہیں کرنا  
 چاہتا تھا حالانکہ ”الاخوان“ اس معاملہ میں اس سے بدظن بھی ہو گئے۔  
 اب انگریزوں نے جو اس طرح کی دھکی دی، تو اسے بھی غصہ آ گیا۔  
 اسے اپنے خدا پر کامل بھروسہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ خدا کی قوت سب سے  
 بالا و برتر ہے اگر انگریزوں نے امداد روک دی تو کیا ہرج ہے، خدا  
 مسببُ الاسباب ہے، وہی مدد کرے گا۔

— (۳) —

انگریزوں کی امداد کے ساتھ، عبداللہ چار ہزار سپاہیوں کی  
 باقاعدہ فوج اور دس ہزار بدویوں کے ساتھ، جدید آلات حرب کے  
 مسلح، خرماسین کی طرف بڑھا اور تباہ پر قیام کیا۔ ابن سعود نے بھی

ستفہ کے چشموں کے پاس پڑاؤ ڈال دیا۔ خرم کا عامل لوتی بھی اپنے  
 پیر پر کھڑا ہو گیا۔ خرم میں ”الاخوان“ بھرے پڑے تھے۔ مخبروں نے  
 اطلاع دی کہ عبداللہ ترابہ کے تختستان میں، بے فکری اور اطمینان سے  
 پڑا ہوا ہے۔ مئی کا آخری مہینہ تھا، چاندنی بھی نہ تھی، لوتی نے اس  
 موقع کو غنیمت جان کر، اپنے الاخوان کی فوج کے ساتھ رات کی تاریکی  
 میں دشمن پر حملہ کر دیا، سپاہی سو رہے تھے، عہدہ دار خیموں کے  
 اندر آرام کر رہے تھے۔ الاخوان نے ایک دم تلوار چلائی شروع کر دی۔  
 بد و منتشر ہو کر بھاگنے لگے۔ الاخوان نے راسل، ششین گن،  
 خیموں وغیرہ سب پر قبضہ کر لیا۔ عبداللہ یہ حال دیکھ کر فوراً اپنے  
 خیمہ سے باہر نکلا اور اسی لباس سے گھوڑے پر بیٹھ کر مکہ کا رخ کیا  
 اور محفل میں پہنچ کر سارا قصہ اپنے باپ کو سنایا۔

حسین کی فوج کا خاتمہ ہو گیا۔

جیسی ہی یہ خبر عام ہوئی طائف والوں کے اوسان خطا ہو گئے۔  
 مکہ اس وقت بیرونی ممالک کے نابائین سے بھرا ہوا تھا۔ یہ خبر سن کر  
 وہ بیچارے بدحواس ہو گئے اور جدہ کی طرف چل نکلے۔ وہاں یوں  
 اور الاخوان کا خوف تمام مجازیوں کے دلوں پر بیٹھ گیا۔ حسین بڑے  
 مضبوط دل کا آدمی تھا۔ اس نے عبداللہ کو لعنت و ملامت کی اور  
 انگریزوں کو فوری امداد کے لیے لکھ بھیجا۔

ابن سعود نے اس دفعہ کچھ نہ کیا بلکہ اس کے بے قاصدہ الاخوان



ہی نے دشمن کو مار بھگایا۔ وہ فتحمدانہ انداز میں ترابہ میں داخل ہوا۔  
 مکہ جانے میں اب اسے کوئی چیز حائل نہ تھی۔ حسین اور سارا حجاز  
 اس کے رحم و کرم پر تھا۔

ابن سود اب مکہ کا رخ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا لیکن حسین کی  
 ایسا سے انگریزوں نے ابن سود کو واپس جانے کی دھمکی دی، چاہتا  
 تو ابن سود فوراً مکہ پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیتا اور حسین کو شکست  
 دے کر بدلہ لے سکتا۔ حجاز کی فتح اب اس کے لیے مشکل نہ تھی۔  
 الاخوان بھی تگے ہوئے تھے، مشیروں نے بھی یہی صلاح دی لیکن  
 ابن سود اب بہت سنجیدہ ہو گیا تھا، ایسے وقتوں میں عارضی فتح  
 وہ کامرانی کے گھمنڈ میں آپے سے باہر ہونا، اس کی طبیعت کے  
 خلاف تھا، وہ واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے لگا اور  
 اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس وقت انگریزوں سے لڑائی مول لینا قرین  
 مصلحت نہیں۔ کیونکہ ایک تو انگریز زبردست تھے اور دوسرے  
 جنگ عظیم میں انہوں نے فتح پائی تھی اور مشرق کے ایک بڑے  
 حصہ پر ان کا قبضہ تھا۔ ان کا مقابلہ کرنا ناممکن تھا۔

ان سب چیزوں کو اس نے اپنے لوگوں کے آگے پیش کیا اور  
 سمجھایا کہ کافی مال غنیمت ہاتھ آچکا ہے، کئی مہینوں کی بے فکری  
 ہو گئی ہے، ایسے میں خاموش رہنا ہی زیادہ مناسب ہے سیوہوں  
 نے اس کی صلاح کو تسلیم کیا۔ اس کے بعد ابن سود نے خرماس

---

اپنی تھوڑی فوج چھوڑ دی اور عتبہ والوں سے اطاعت کا بھین لے کر  
ریاض کی طرف کوچ کیا اور ایک دوسری سوہنج میں پڑ گیا کہ ترک و تو  
عرب سے بھل چکے، اب انگریز اپنے قدم جما رہے ہیں۔

# گیارہواں باب۔ حائل کی فتح اور سلطان نجد

— (۱۰) —

حسین کو شکست دینے کے بعد ابن سعود کے حوصلے بہت بند ہو گئے، لیکن انگریزوں کا ہاتھ ایسا تھا کہ وہ ایک گہرے فکریں پڑ گیا۔ انگریز بظاہر ریگستان پر قبضہ کرنا تو نہیں چاہتے لیکن اس پر حکومت کرنے کی نیت ضرور تھی اور اس لیے وہ حسین کے دوست بن کر عرب میں اپنے قدم جاری رہے تھے۔ ابن سعود ترکوں کا سرے سے مخالف تھا۔ وہ تو خیر چلے گئے لیکن اب انگریزوں کا سوال پیچیدہ ہو گیا۔ کیونکہ ایک تو جنگ عظیم میں فتح یاب ہونے سے ان کی قوت بڑھ گئی تھی اور دوسرے شام، فلسطین، حجاز، یمن، عسیر اور ہماہلی کے ہاتھ میں تھے۔ ابن سعود کو وسط عرب پر

حکمران تھا تاہم وہ مٹھی بھر آدمیوں کی بے قاعدہ فوج سے انگریزوں سے  
کیا مقابلہ کر سکتا؟ اسی لیے سنجیدگی سے اس نے مڈبھیڑ نہیں کی اور  
جہاں تک ہو سکے ان سے مل ملا کر کام نکالنا ہی مناسب سمجھا۔

انگریزوں کے ہاتھ میں اب بہت سے وسیع مگر منتشر علاقے  
تھے۔ ان کے پاس اتنی فوج نہ تھی جو ہر مقام پر متعین کی جاسکتی۔  
نیز جنگ عظیم میں لڑتے لڑتے انگریزی فوج تنگ آچکی تھی۔  
اسے آرام کی ضرورت تھی۔ ایسی حالت میں انگریزوں کے لیے یہ  
دقت طلب مسئلہ بن گیا کہ آیا عرب کو اپنے قبضہ میں رکھنے کے لیے  
فوج رکھی جائے یا کوئی ایسا طریقہ کار اختیار کیا جائے کہ جس سے  
آسانی کے ساتھ مقصد نکل آئے۔ انگریز مدبرین، عرب پر خواہ مخواہ  
اپنا روپیہ خرچ کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے صلاح دی کہ شام  
کی انقلابی انجمن کے سلسلہ میں ”عرب اتحاد“ قائم کر کے اس کی  
صدارت حسین کو دی جائے۔ حسین چونکہ حجاز کا والی ہے اور مسلمان  
اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس طرح سے ہمارا مسلمانوں پر  
اچھا اثر قائم ہو جائیگا اور اگر حسین کو خلیفہ بھی بنا دیا گیا تو ہندوستان  
کے مسلمان ہمارے ہاتھ میں آجائینگے۔

بادی النظر ہی یہ اسکیم بہت سادہ اور سودمند معلوم ہوئی لیکن  
اصل میں یہ ایک ہوائی پل تھا، واقعات اس کے منافی تھے کیونکہ  
”عرب اتحاد“ کا قیام سرے سے ناممکن تھا، ہو تو کیسے؟ نہ کوئی

عرب قومیت ہی کا وجود تھا اور نہ اہل عرب حسین کو اپنا سردار تسلیم کرنے تیار تھے۔ اس کے علاوہ حسین کے ترکوں میں علی اور زہاد بہت ہی معمولی دل و دماغ کے انسان تھے البتہ عبداللہ کسی قدر اہل تھا مگر وہ کچھ مشتبہ۔ مزید برآں حسین صرف زمانہ ساز تھا، گو بہادر سہی مگر نہ عرب اتحاد کے بوجھ کو سنبھالنا اس کے امکان سے باہر تھا۔ اب یہ خیال کہ ہندوستان کے مسلمان حسین کی حکومت سے خوش ہو گئے تو یہ بھی ناممکن تھا، دنیاوی عیش و آرام اور حکومت کی خاطر انگریزوں سے مل کر ترکوں کا یعنی برادان اسلام کا خون بہانا، ایک ایسا فعل تھا جسے کسی خطہ کے مسلمان بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔

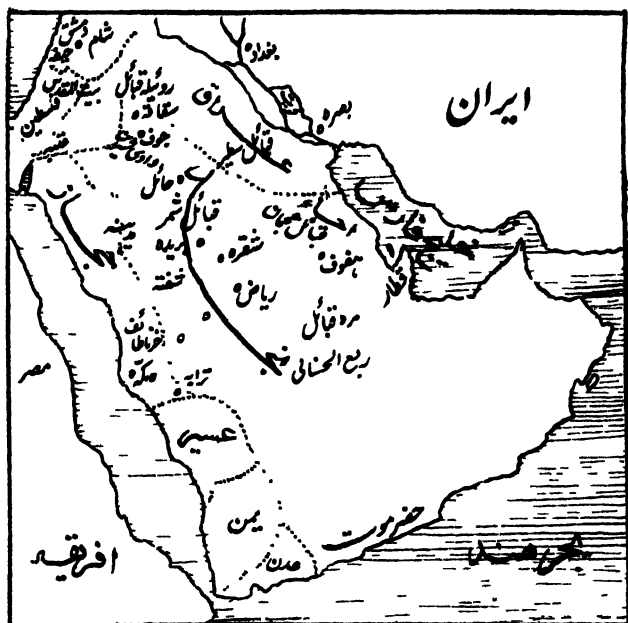
انگریز مدبرین نے ان حالات پر بہت غور و خوض کیا۔ اور اکثروں نے اس اسکیم کی مخالفت کی اور اپنے اصولی استدلال پیش کیے۔ لیکن کرنل ٹی، اسی لارنس اس اسکیم کی موافقت میں تھا اور اسے قابل عمل تصور کرتا تھا۔ سینٹ جان فلبی عرب کے حالات اور بالخصوص ابن سعود کی اہمیت سے واقف تھا۔ اس نے اس اسکیم کی سوسے مخالفت کی لیکن ٹی۔ اسی لارنس نے ایک نتیجہ۔ انگریزوں کو لارنس پر بہت کچھ بھروسہ تھا، انہوں نے عرب اتحاد کے قیام کا تصفیہ کر لیا۔

ابن سعود اس وقت ریاض میں تھا۔ یہ اطلاحیں جب اس کے کانوں تک پہنچیں تو اس نے دمشق میں اپنے نمایندے بھیجے تاکہ وہ صحیح واقعات سے مطلع کریں۔

ابن سعود کو اطلاع ملی کہ ابن رشید، حسین اور سلیم سب کے سب انگریزوں سے امداد لے کر اس پر ٹوٹ پڑنے والے ہیں۔ انگریزوں کی ایسا سے فیصلہ دمشق کا حکمران بھی مقرر ہو گیا۔ یہ حالات دیکھ کر ابن سعود نے انگریزوں سے دریافت کیا کہ آیا وہ اب پہلے کی طرح اس کے دوست ہیں یا نہیں۔ انگریزوں نے سنہ ۱۹۰۴ء کے اواخر میں بندہ کے ہائی کمشنر سر پرسی کاکس (Sir Percy Cox) کو ابن سعود کے پاس روانہ کیا۔ عجم پر ان دونوں کی ملاقات ہوئی لیکن اس سے ابن سعود کو کچھ تسخفی نہ ہوئی۔

اب ابن سعود کے اطراف دشمن ہی دشمن تھے۔ احسا کے علاوہ تمام ساحلی علاقے دشمنوں کے ہاتھ میں تھے۔ ابن سعود چاہتا تھا کہ دشمنوں کے اس جتھے کو توڑے اور یہ اس کے لیے کچھ زیادہ مشکل بھی نہ تھا لیکن بڑی دقت یہ تھی کہ ان تینوں میں ابن سعود جس کسی سے لڑتا انگریز اس کا ساتھ دیتے اور یہ انگریزوں کا مقابلہ نہ کر سکتا۔ ایسے نازک وقت میں اگر کوئی دوسرا ہوتا تو اس کے ہوش پر ان ہو جاتے اور چپکے سے وہ بھی انگریزوں کے سایہ عاطفت میں آجاتا۔

لیکن ان پریشان کن حالات کے باوجود ابن سعود کے ہاتھ سے استقلال کی ہلک نہ چھوٹی۔ وہ ہر ناکامی کو کامیابی کا پیش خیمہ اور ہر مصیبت کو راحت کی منادی سمجھتا تھا!



ابن سعود واقعی قسمت کا دھنی تھا۔ اسے خدا پر کامل بھروسہ تھا اور ہر مصیبت اور راحت میں وہ خدا کی یاد کو دل سے نہ بھلاتا تھا۔

خدا نے آٹے و قوتوں پر اس کی امداد کی اور وہ کامیاب بھی رہا۔ چنانچہ جب ہر طرف سے اسے مایوسی ہو گئی تو ۱۹۲۱ء میں اسے ایک بہترین موقع ہاتھ آیا۔ اس کے حریفوں میں سب سے زیادہ کمزور حالت رشیدیوں کی تھی۔ ابن سعود نے بنی قحمر کے پاس اپنے ملا اور مبلغ روئے کیے کہ ان کو رشید کے خلاف اگایا جائے۔ یہ مذہبی پیشوا نہایت جرأت کے ساتھ بلا خوف و خطر تبلیغ کرنے لگے۔ شمری ان پر اعتقاد لاکر ساتھ ہو گئے۔ اور اس طرح شمریوں کی قوت بٹ گئی۔ اس اثنا میں ابن رشید کا بھی انتقال ہو گیا اور اس کے ورثاء اقتدار و حکومت کے لیے ایک دوسرے کا گلا گھونٹنے لگے۔ ادھر رشیدیوں کا یہ حشر ہوا اور ادھر سلیم کا انتقال بھی ہو گیا۔ اس کا لڑکا احمد بالکل نا اہل تھا۔ یہ سب باتیں ابن سعود کے حق میں مفید ثابت ہوئیں اور اسے اپنے اقتدار کے دائرہ کو وسیع کرنے کا کافی موقع مل گیا۔ بنی شمر میں اب دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک ابن سعود کے موافق اور دوسرا خلاف۔ مخالف گروہ نے حسین سے امداد کی درخواست کی۔ لیکن حسین خود اپنے معاملات میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ اس طرف توجہ نہ دے سکا۔ وہ انگریزوں کے برتنے پر کود رہا تھا لیکن انگریز خود اپنے معاملات میں اس قدر سرگرواں تھے کہ انہیں کچھ دیر کے لیے حسین پر سے اپنی توجہ ہٹا یعنی پڑی۔ عراق میں بنیاد میں ہو رہی تھیں مصر اور ہندوستان میں ایک ہڑ بونگ



پچی ہوئی تھی۔ یہ واقعات انگریزوں کے لیے بہت زیادہ اہم تھے اور ان کی توجہ فی الوقت انہی پر مرکوز تھی۔

اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔ ابن سعود کے لیے اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا؟ میدان خالی تھا۔ ابن سعود نے جنگ کا اعلان کر دیا اور دویش کی معیت میں دو ہزار ”الاخوان“ کو قبیلہ شمر پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا، الاخوان کی ایک اور جماعت کو دیگر قبائل کی فراہمی کے لیے بھیجا۔ سب لوگ خوشی خوشی جمع ہونے لگے، انہیں اونٹ اور ہتھیار تقسیم کر دیے گئے۔

جب ابن سعود روانگی کے لیے پوری طرح تیار ہو گیا تو اسے اطلاع ملی کہ بنی شمر نے الاخوان کا جو انمردانہ مقابلہ کیا اور دویش کو انہیں شکست دینے میں بڑی دقت اٹھانی پڑی۔ اس لڑائی میں بریدہ کا عامل قہد اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے۔ یہ سن کر ابن سعود اپنی فوج کو بہت تیزی کے ساتھ تیار ہونے کا حکم دیا اور جب سب فوج تیار ہو چکی تو دوسرے ہی دن صبح کو ابن سعود کا قافلہ روانہ ہوا۔ ریاض کا علمبردار مطرف سب سے سامنے ابن سعود کا سبز و سفید جھنڈا لیے ہوا تھا۔ اسی کے پیچھے ابن سعود اپنے زبردست اونٹ پر سوار تھا۔ اس کے پیچھے اس کا ۱۹ سالہ لڑکا سعود تھا۔ اطراف میں نجد کے ایک ہزار جنگجو محافظ دستہ کے طور پر ان کے ہمراہ تھے۔ سیدھی جانب الاخوان اور

بائیں جانب دو اسیر۔ ان کے پیچھے شہریوں اور دیہاتیوں کا ایک  
جھم غمیر اپنے اپنے سرداروں کی سرکردگی میں۔ جزیہ اشعار پڑھتے  
ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

قبیلہ شمر کے لوگ بلاشبہ بڑے بہادر اور جنگجو تھے لیکن ان کا  
کوئی مستقل رہبر نہ تھا جس کی وجہ سے وہ باقاعدہ حملہ سے مجبور تھے۔  
حسین اور فیصل نے اس موقع پر ان کی فدی بھی مدد نہ کی جس کا نتیجہ  
یہ ہوا کہ جس وقت ابن سعود حائل پہنچا کسی نے اس کی مدافعت  
نہ کی انہوں نے شہر میں بلا کھٹکے داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس نے  
حائل میں ایک فوجی دستہ چھوڑ دیا اور خود شمری قبائل کو مزہ چکھانے  
کے لیے آگے کی طرف روانہ ہوا۔ شمری قبائل کے بعض لوگوں نے  
اس کی اطاعت قبول کر لی اور اکثر عراق کی طرف بھاگ نکلے۔  
جن لوگوں نے اس کی حکومت تسلیم کی ان کے ساتھ ابن سعود نے  
بہت اچھا برتاؤ کیا۔ رشیدی خاندان کے پسماندوں کو ریاض  
بھیج دیا اور وہاں ان کے رہنے کے لیے مکان اور کام کاج کے لیے  
غلام دیے۔ ابن رشید کی بیوہ سے خود عقد کر لیا۔ اس کے بچوں  
کی پرورش بھی اپنے ذمہ کر لی اور اس طرح رشیدی خاندان سے  
رشتہ جوڑ لیا۔

ابن سعود کی یہ کامیابی بہت ہی شاندار تھی۔ اس سے اس کی  
شخصیت مسلم ہو گئی، دشمنوں پر اچھا اثر بیٹھا اور انگریزوں نے بھی

اسے محسوس کیا۔ جب ابن سعود ریاض واپس آیا تو عبدالرحمن مبارکباد دینے کے لیے شہر سے باہر آیا۔ تمام شہری اس کے پیچھے تھے۔ عبدالرحمن پھولوں نہیں سمارہا تھا کیونکہ ایک مدت کے بعد اس کی دلی تمنا آج پوری ہوئی تھی۔ رشیدی خاندان کو شکست دے کر حال پر حکومت کرنا، عبدالرحمن کی انتہائی آرزو تھی۔ اور آج اس کے سعادتمند لڑکے نے باپ کی خواہش پوری کی تھی پھر وہ کیوں اس پر نازاں نہ ہو؟

دوسرے دن ایک شاہی دربار ہوا۔ علماء، قبیلوں کے سردار اور دیگر اکابر سلطنت جمع ہوئے۔ عبدالرحمن نے اس جلسہ کی صدارت کی اور ابن سعود کو

سُلطان بنجدا

کا خطاب دیا۔

# بارہواں باب

## مکہ کی فتح

(۱)

حائل کے شمال میں شام اور فلسطین کی سرحد تک عظیم الشان کھلے میدان پڑے ہیں۔ یہ میدان قبائل شمر اور رویلہ کے زیرِ تصرف تھے اور وہیں وہ اپنے جانور چرایا کرتے تھے۔ ان میدانوں کے وسط میں، ریاض سے کوئی سات سو میل شمال کی طرف جوف اور سقاۃ کے سرسبز و شاداب نخلستان ہیں۔ ان کے پہلوؤں سے وادی شیریں گذرتی ہے۔ اس وادی کی لمبائی ڈھائی سو میل کے قریب ہے اور اس کے اطراف کئی چھوٹے بڑے گاؤں آباد ہیں۔

ابن سعود نے اپنے لوگوں کو ان میدانوں کی طرف روانہ کیا۔ اس کے فرستادہ ملا اہل قبائل کو اپنا معتقد بنا رہے تھے اور

الاخوان جوش میں آ کر آگے کی طرف قدم بڑھا رہے تھے۔ قبائل روٹیلانے کچھ بھی مخالفت نہیں کی کیونکہ ان کا کوئی سردار نہ تھا، فوری سہیلان بوڑھا ہو گیا تھا اور دمشق جا کر فرانسیسیوں کے سایہ عاطفت میں اپنی زندگی کے بقیہ دن گزار رہا تھا۔ البتہ اس نے اپنے پوتے کو الاخوان کی مقابلہ کے لیے بھیجا جو پسا ہو کر واپس چلا گیا۔ جوف اور شقاقہ کے عاملوں نے جب یہ حالت دیکھی تو چپکے سے ابن سعود کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد دوسرے گاؤں نے بھی ابن سعود کو اپنا حاکم تسلیم کر لیا۔ اس طرح سے الاخوان اپنی فتوحات کا علم بلند کرتے ہوئے فلسطین کی سرحد کے قریب پہنچ گئے۔ اب تو ان حالات کو دیکھ کر انگریزوں کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ جوف اہل میں شمالی ریگستان کی کنجی تھی۔ یہی بدویوں کا مرکز تھا، مصر، بغداد اور شام و خلیج فارس کے درمیان یہی ایک عمدہ رستہ تھا اور یہ ایسا مرکزی مقام تھا کہ جس کسی کی وادی شیریں پر حکومت ہوتی وہ شام، فلسطین اور شرق اردن پر اطمینان سے دباؤ ڈال سکتا تھا۔

انگریز سمجھ گئے کہ ابن سعود ان کے لیے خطرناک ہوتا جا رہا ہے اور اگر اب بھی اسے نہ روکا گیا تو یقیناً اس کا دائرہ اثر وسیع تر ہو جائیگا۔ انگریزوں نے اس غرض سے فوراً ابن سعود سے نامہ و پیام شروع کر دیا اور اسے کافر نس میں آنے کی دعوت دی۔

ابن سعود کے مشیر الاخوان کی طرح جو شیلے تھے۔ انہوں نے کہا کہ انگریزوں سے ملنا ملنا فضول ہے انگریز کچھ نہیں کر سکتے۔ ترک اور افغان ان پر چڑھائی کر رہے ہیں، ہندوستان میں بھی بد امنی پھیلی ہوئی ہے اور خود انگلستان خانہ جنگیوں کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں انگریزوں سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں۔

بہ سب سنی سنائی خبریں تھیں۔ ابن سعود کے مشیر اور الاخوانی جوش میں آکر معاملہ فہمی اور سنجیدگی سے دُور ہو گئے تھے۔ لیکن ابن سعود اب ایک بڑا مدبر اور سیاست ہو گیا تھا۔ وہ ان حالات کو سب سے بہتر جانتا تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ انگریزوں کی قوت اب بھی ویسی ہی ہے جیسے پہلے تھی، اور یہ کہنا کہ انگریز کمزور ہو رہے ہیں، ایک بے بنیاد حقیقت معلوم ہوتی تھی۔ اس لیے ابن سعود نے انگریزوں سے گفت و شنید کرنے کا تہیہ کر لیا اور کانفرنس میں اپنے نمائندے بھی روانہ کیے۔

ابھی گفت و شنید کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ کوئی ڈیڑھ ہزار الاخوانی نوجوان ابن سعود کو اطلاع دیے بغیر خنجر سے نکلے اور حائل ہوتے ہوئے شمال میں کوئی ایک ہزار میل تک آگے بھل گئے اور وہاں پہنچ کر انہوں نے شہر توریب کو لوٹ لیا اور عہد توں مردوں بوڑھوں، بچوں سب کو ایک ساتھ قتل کر ڈالا۔ ان کا یہ طرزِ عمل ریگستانی جنگ کے خلاف تھا کیونکہ جنگ صرف جنگجوؤں کے لیے

ہے نہ کہ سب کے لیے۔ لیکن الاخوانی مذہب کے اندھے تھے چونکہ توریسی  
ان کے عقائد کے خلاف تھے اس لیے یہ بھی قدیم دستور اور رسمیات  
کو بالائے طاق رکھ کر جو جی میں آئی کر گزرے۔

لیکن جیسی ہی یہ خبر بنی مشاکرہ کو ملی تو یہ لوگ الاخوان جماعت  
پر ٹوٹ پڑے اور عمان سے بھی انگریزی فوج موٹر لاریوں میں بھر کر  
آئے گی۔ اسی اثنا میں طیارے بھی آتے تھے۔ غرض ایک سنگامہ برپا  
ہو گیا جس میں کوئی ایک ہزار کے قریب الاخوانی لقمہ اجل ہو گئے۔ اور  
پانچ سو جوج رہے تھے انہیں بنی شاکر نے بے آب و دانہ ہلاک  
کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان جوشیلے نادانوں میں سے صرف آٹھ آدمی  
بچ آئے۔

(۲)

الاخوان کی اس جاہلانہ حرکت سے ابن سعود سخت ناراض  
ہوا۔ وہ ہمیشہ انہیں سمجھاتا رہا کہ جوش کی حالت میں دوراندیشی  
کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑنا سراسر حماقت ہے۔ اب اہل قبائل نے  
پہلی دفعہ تسلیم کیا کہ واقعی ابن سعود بہت ہی معاملہ فہم اور صالح  
ہے۔ ابن سعود نے ان آٹھ پسماندوں کو سخت سزا دی تاکہ دوسروں  
کو پھر کبھی ایسی جرأت کرنے کی ہمت نہ ہو۔

اس معاملہ کی کیسوی کے لیے ابن سعود نے سر پرسی کاکس  
(Sir Percy Cox) کو مجیر پر ملنے کی دعوت دی۔ کاکس اعد

ابن سعود میں قد و قامت اور کردار کے لحاظ سے ایک گونہ مشابہت تھی۔ ابن سعود سنتا بہت اور کہتا کم تھا۔ یہی کاکس کا بھی حال تھا۔ دونوں اپنا مافی الضمیر بیان کرنے میں حد درجہ محتاط تھے۔ کاکس نے ابن سعود کے آگے سرحد کے تعین کا مسئلہ پیش کیا۔ ترکی حکومت کے زمانہ میں سرحد کا کوئی تعین نہ تھا، ہر شخص کو اختیار تھا کہ جہاں چاہے اپنے جانور چرائے، اور جن چشموں کا چاہے پانی استعمال کرے۔ ایسے وسیع ریاستان میں سرحد کی حدود کا قائم کرنا بہت دقت طلب تھا لیکن کاکس نے اس پر بہت زور دے کر اسے قابل عمل بتلایا۔ لیکن ابن سعود نے سمجھایا کہ ایسی حدود عرب کے ریاستان میں بے معنی ہیں کیونکہ قبائل اس کی زدی بھی پرواہ نہ کریں گے۔ ابن سعود جانتا تھا کہ اس طرح کی حد بندی ہو جائے تو وہ ہر طرف سے دشمنوں کے نرغے میں ہوگا۔ بہر حال کئی دن تک ابن سعود اور کاکس کے درمیان اس مسئلہ پر بحث ہوتی رہی اور آخر میں یہ طے پایا کہ حائل، شمر اور جوف پر ابن سعود کی حکومت رہے گی اور امن قائم رکھنے کے صلے میں انگریزوں کی طرف سے اسے کچھ سونا ماہوار دیا جائیگا۔ ساتھ ہی اس کے نجد اور عراق کے درمیان سرحد قائم کر دی گئی اور دونوں سرحدوں کے درمیان کچھ حصہ مشترکہ طور پر چھوڑ دیا گیا کہ جانبین اس سے استفادہ کر سکیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی تصفیہ ہوا کہ سرحد کے قریب یا چشموں کے



پاس کوئی قلعہ تعمیر نہیں کیا جائیگا۔

(۳۰)

تصفیہ تو ہو گیا لیکن ابن سعود کو اس سے کچھ تشفی نہیں ہوئی بلکہ وہاں سے وہ بہت کچھ افسردہ واپس آیا۔ اسے بے حد فصدہ آیا اور وہ چاہتا تھا کہ ایک دم انگریزوں پر ٹوٹ پڑے لیکن نتیجہ پر نظر ڈالتے ہوئے خاموش رہ گیا۔ اس نے اپنے ایک دوست سے کہا ”دیکھو، انگریز جو چاہتے ہیں انہیں مل جاتا ہے اور ہم جب کچھ چاہتے ہیں تو اس کے لیے لڑائی کرنی پڑتی ہے!“

اہل قبائل کا بھی یہی حال تھا۔ بالخصوص قبیلہ مطیر کے لوگ بہت بے چین تھے۔ لطف یہ تھا کہ انگریز ادھر ابن سعود کو خاموش رہنے کے لیے کہتے اور جب ادھر اس کے دشمن اس پر حملہ یا ظلم کرتے تو وہ انجان رہ جاتے تھے۔ چنانچہ بنی شمر کے جن لوگوں نے بغداد میں پناہ لی تھی، فیصل نے انہیں ہتھیار دے کر نجد پر دھاوا بولنے کی اجازت دے دی۔ عبد اللہ نے دادی شیریں میں اپنی فوجیں روانہ کر کے چذ گاؤں پر قبضہ کر لیا، حسین نے حرب اور عتبہ والوں کو دھکیا دیں۔

الانخوان حد درجہ جوش میں تھے۔ صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً عراق میں جو شمیری پناہ گزیں تھے ان پر حملہ کر کے بدلہ لے لیا اور شمال کی طرف دادی شیریں

بڑھ کر حسین اور شریف مکہ پر حملہ کا مطالبہ کرنے لگے۔ تمام قبائل اسی طرح غضبناک ہوتے جا رہے تھے اور ابن سعود بھی اپنے آپ پیچ و تاب کھا رہا تھا اور ”گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل“ کی الجھن میں پڑ گیا۔ انگریزوں نے پھر سے ایک مرتبہ ابن سعود کو سمجھوتہ کے لیے دعوت دی۔ لیکن اس دفعہ کاکس کی عدم موجودگی کے باعث، دوسرے انگریز نمائندے ابن سعود سے کچھ ملے نہ کر سکے اس لیے کہ وہ ابن سعود کی حقیقی حیثیت اور اس کے اثر سے ناواقف تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ محض ریاض کا امیر ہے حالانکہ وہ نجد کا سلطان اور وسط عرب کا دالی تھا۔ انگریزی نمائندوں کا برتاؤ ابن سعود کے ساتھ کچھ ٹھیک نہیں رہا جس سے ابن سعود ایک سچے عرب کی طرح بھرپور اٹھا۔ اب اسے روکنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔

”ہاں“ اس نے کہا ”یہ سچ ہے کہ میں انگریزوں کا دوست ہوں لیکن ان کا ساتھ صرف اس حد تک دے سکتا ہوں جس حد تک مجھے میرا مذہب اور میرا مرتبہ اجازت دے سکتا ہے“ پھر بھی ابن سعود نے خود مضبوطی سے کام لیا اور صرف موقع کا منتظر تھا۔ ناممکن کے آگے سر مارنا اس کی زندگی کا اصول نہ تھا۔

— (۴) —

ابھی کانفرنس ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ خبر آئی کہ حسین نے خرمہ اور ترابہ پر حملہ کر کے اُن دونوں شہروں پر قبضہ جالیا ہے،

اور عبداللہ اور فیصل اپنی اپنی فوجیں لے کر اس کی امداد کو آچکے ہیں۔ اور اب نجد پر حملہ کرنے والے ہیں۔ یہ سن کر ابن سعود آپنے سے باہر ہو گیا اور سارا نجد غصہ سے آگ ہو گیا۔ چاہے کچھ ہی ہو، عقلمندی یا بوقوتی، اب کی دفعہ تو وہ حسین پر حملہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن اسے بدقسمتی کہیے کہ ان دنوں ابن سعود کے چہرے پر سُرخ بادہ کی علامات ظاہر ہونے لگیں اور وہ اسی سلسلے میں اتنا سخت طویل ہوا کہ صرف ڈھانچہ باقی رہ گیا۔ اپنے بستر سے حرکت کرنا تک اسے بار تھا۔ آخر کار اس کا بخار کم ہوا اور سُرخ بادہ کے زہریلے اثرات کم ہو گئے، لیکن ساتھ ہی اس کے اس کی بائیں آنکھ درد دینے لگی۔ اور چند دنوں میں بصارت جاتی رہی۔ مقامی ڈاکٹر و س سے علاج کرایا لیکن بے سود۔ پھر شامی ڈاکٹر کو بلایا، اس کے علاج سے کچھ افادہ تو ہوا لیکن بصارت نہ آئی۔ آخر میں ایک مصری ڈاکٹر سے آپریشن کرایا گیا جس سے بصارت عود کر آئی۔

بیماری کے زمانے میں ابن سعود اپنے دشمنوں کی حرکات و سکنات سے بے خبر نہیں رہا اور حتی الوسع کچھ نہ کچھ کام بھی کیا کرتا تھا۔ لیکن ابن سعود کی قسمت زوردار تھی۔ جب کبھی حالات اس کے مخالف ہوئے قدرتی طور پر اس کی امداد کے وسائل بہم پہنچ گئے۔ چنانچہ خرماء اور ترابہ کے باشندوں نے حسین کی شدید مخالفت کی اور اس کی فوج پر حملہ کر کے اسے مار بھگایا۔ عام طور سے

لوگ حسین، شریف مکہ کے برتاؤ سے ناالاں تھے، انہیں شکایت تھی کہ حسین خود مختار حکمراں ہے۔ سب کام اپنے ماتحتین سے کراتا اور اپنی جیب بھرتا ہے۔ عہدہ داروں کی تنخواہیں اس لیے گھٹادی گئی ہیں کہ وہ رشوت سے اس کی تکمیل کر لیں۔ نیز وہ اس بات کے بھی شاکی تھے کہ حسین ملکی فلاح و بہبود کے معاملہ میں کسی نیک اور مفید مشورہ کو سننا گوارا نہیں کرتا بلکہ اگر کوئی اس قسم کی جرأت کرتا تو اسے قید خانہ کی ہوا کھلا دی جاتی۔ اس سے حجاز کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ آمدنی کا شیر حصہ شریف کی جیب خاص میں جاتا۔ قربانی کے بکروں کا ٹھیکہ اسی نے لے رکھا تھا۔ بدویوں سے سستے دام بکرے خرید لیے جاتے اور حاجیوں کو خاصے دام لے کر فروخت کیے جاتے۔ حاجیوں سے باوجود اس کے کہ کثیر رستم لی جاتی تھی لیکن ان کی آسائش اور جان کی حفاظت کی کوئی ذمہ داری نہیں لی جاتی تھی۔ بالخصوص جاؤا کے غریب حاجی ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں بھوک پیاس کا شکار ہوتے تھے۔

اس بد انتظامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ حاجیوں کی تعداد میں کمی ہو گئی اور اہل حجاز کو جو تھوڑی بہت آمدنی ہوتی تھی، وہ بہت کچھ گھٹ گئی۔ نہ صرف یہی بلکہ اہل حجاز پر بہت سے نئے نئے ٹیکس لگائے گئے انگریزوں کی امداد کے بند ہو جانے کی وجہ سے حسین نے اپنی آمدنی کے برقرار رکھنے کے لیے اہل ملک اور حجاز سے اس کی تلافی

کمرانی چاہتا تھا۔

تمام حجاز حسین سے ملاں تھا، خود اس کے ملازم اور سپاہی اس سے بدظن ہو گئے تھے۔ وہ ترکوں کا زمانہ یاد کرنے لگے جب کہ حاجی کثیر تعداد میں آتے اور دل کھول کر رویہ خراج کرتے تھے۔ اس زمانہ میں اہل مکہ و مدینہ پر ظلم کو ٹیکس نہ تھا بلکہ لٹے حاجیوں سے انہیں بہت کچھ مل جاتا تھا۔ لیکن حسین کا برتاؤ ان کے حق میں مفسر ثابت ہوا اور وہ اس کی حکومت سے بیزار آ گئے۔

یہ تو گھر کی حالت تھی۔ بیرونی ممالک بھی حسین سے اسی طرح بدظن ہو گئے تھے۔ حسین کے برتاؤ سے مصر، ترک، ہندوستان غرض ہر جگہ کے مسلمان تنگ آ گئے تھے، حسین کو ان سب باتوں کی اطلاع تھی لیکن اس کے باوجود بلاد عرب کی شہنشاہیت کا جنون اور بڑھ چکا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو خدا فرستادہ جتلا کر اس کے نبوت میں کلام پاک کی آیتیں تلاوت کرنے لگا جس پر اسلامی دین نے خوب مضحکہ اڑایا۔

اسی جوش جنوں میں حسین نے انگریزوں سے بھی مخالفت پیدا کر لی اور ان سے ان تمام معاہدات کی تکمیل کا مطالبہ کیا جو جنگ عظیم کے زمانہ میں ہوئے تھے۔ وہ خود کو ملک عرب کا شہنشاہ تسلیم کروانا اہد شام سے فرانسیسیوں اور فلسطین سے غیر ملکی یہودیوں کو اغفال باہر کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلہ میں اس نے شام اور فلسطین کے

عربوں کو بھڑکایا اور انگریزوں اور فرانسیسیوں کے خلاف انہیں امداد دیتے کا بھی وعدہ کیا۔

انگریزوں نے معاملہ کا سمجھوتہ کرنے کے لیے کرنل لارنس کو حسین کے پاس روانہ کیا کہ وہ حسین کو یہ بات سمجھائے کہ اگر وہ صلح نامہ وکٹوریا پر دستخط کر دے تو انگریز ہر بیرونی حملہ کے خلاف اس کو مدد دیں گے اور خواہ وہ حملہ ابن سعود ہی کی طرف سے کیوں نہ ہو۔ لارنس نے حسین کو اپنے خیالات کا اہم نوا بنانے کی ممکنہ کوشش کی لیکن حسین نے ایک نہ مانی بلکہ یہ کہہ دیا کہ

”بہ جائے اس کے کہ میرے کندھے انگریزوں کے غیر ملکی جوتے سے دبے رہیں۔ یہ ممکن ہے کہ سرزمین عرب پر مطعون ابن سعود کی حکومت کو تسلیم کر لوں“

۱۹۲۲ء میں انگریزوں نے پھر سے ایک مرتبہ مصالحت کی کوشش کی مگر حسین اپنی بات پر جما رہا۔ ضعیف العمری کے باعث استدلال اور فیصلہ کی قوتیں اس سے مفقود ہوتی جا رہی تھیں۔

اس زمانہ میں انگریزوں کو بھی چین نصیب نہ تھا۔ اگرچہ انگریز جنگ عظیم میں کامران رہے تاہم جنگی اخراجات اس قدر عائد ہو چکے تھے کہ مالیہ کو سنبھالنا ایک اہم ترین کام ہو گیا تھا۔ جب خود ملکی اخراجات کا سوال معرض بحث میں آجائے تو ایسی صورت میں جو ممالک پر اپنا روپیہ خرچ کرنا ان کے لیے محال اور ناممکن تھا۔

مالی مشکلات کے علاوہ بہت کچھ سیاسی پیچیدگیاں بھی پڑی ہوئی تھیں جو ہر بڑی جنگ کا لازمی نتیجہ ہیں۔ فرانسیسی حکومت سے تعلقات صاف نہیں تھے۔ آئرلینڈ میں مخالفتیں بھیل رہی تھیں، ہندوستان میں ایک پھل مچی ہوئی تھی، افغانی بھی کچھ جنگ کے لیے تلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ مصر اور عراق میں بھی جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ترک موصل پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ ان حالات کی تحت انگریز حسین کے ساتھ جھگڑ کے اپنا روپیہ خرچ کرنا اور جنگ عظیم کے تھکے ماندے سپاہیوں کا روانہ کرنا قرین مصلحت نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے فی الحال اس مسئلہ کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھنا ہی مناسب تصور کیا۔

اس زمانہ میں ابن سعود نے حسین پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ حسین کے بیٹوں، فیصل اور عبد اللہ نے باپ کو بہتیرا بھجایا کہ وقت نازک ہے، انگریزوں سے مل کر کام کرنا ہی مناسب ہوگا۔ لیکن یہ بات حسین کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ فیصل اور عبد اللہ نے انگریزوں سے درخواست کی کہ وہ ابن سعود کو حملہ سے روکیں۔ لیکن اب انگریز اس جنجال میں پڑنا نہیں چاہتے تھے انہوں نے صاف کہہ دیا۔

”حسین اور ابن سعود دونوں ہمارے حلیف اور خود مختار حکمران ہیں۔ اگر یہ دونوں ایک دوسرے سے ماضی نہیں تو خود انہیں

اپنے اختلافات دور کر لینے چاہئیں۔ ہم مداخلت کرنا نہیں چاہتے۔“ اس اثناء میں ابن سعود کو پوری صحت ہو گئی اور اس نے حسین پر حملہ کرنے کی باقاعدہ تیاری شروع کر دی۔ عرب، عقیبہ اور حجاز میں اپنے ملاؤں کو روانہ کیا کہ وہ وہاں کے باشندوں کو حسین کے خلاف اکسائیں اس سلسلہ میں انہیں کچھ زیادہ دقت اٹھانی نہیں پڑی کیونکہ ماحول پہلے ہی سے حسین کے خلاف ہو چکا تھا۔ ابن سعود نے اپنی مقبولیت کے لیے بیرونی ممالک سے بھی تعلقات اچھے رکھے۔ فراموشی اس کے مخالف نہ تھے، مصر اور ہندوستان کے مسلمان بھی اسے پسند کرنے لگے تھے، انگریزوں کو بھی اس کے خلاف حرف شکایت زبان لانے کی گنجائش نہ تھی کیونکہ عراق اور شرقِ اردن میں اگر سعودی کچھ گڑ بڑ مچاتے تو ابن سعود ان کو سزا دیتا اور ایسی بدعنوانیوں کو روکتا رہتا تھا۔

۱۹۲۷ء کے اوائل میں حسین اپنے لڑکے عبداللہ کے پاس شرقِ اردن گیا اور اس شہر پر اپنا قبضہ کر کے اسے واسطی بنا دیا۔ کیونکہ وہ اب انگریزوں کا تسلط نہیں چاہتا تھا۔ اس زمانہ میں ۳۰ مایچ ۱۹۲۷ء کو ترکی خلافت کا خاتمہ ہو گیا۔ ساتھ ہی حسین نے خود کے خلیفۃ المسلمین ہونے کا اعلان کر دیا۔ یہ خبر ہوا کی طرح عام ہو گئی۔ اور تمام اسلامی دنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ ابن سعود کے لیے یہ بہترین موقع تھا۔ وہ ہمیشہ موقع کا منتظر رہا۔



ابن سعود بہت ہی بلند اور وسیع خیال کا انسان تھا۔ مغلسی اور بے یار و مددگاری کے زمانہ میں بھی وہ کویت کی گلیوں میں دوست احباب کے ساتھ اپنے شاندار مستقبل کے متعلق ڈینگیں مارا کرتا تھا، لوگ اس پر ہنستے اور قہقہہ لگاتے اور اسے خوب بناتے تھے لیکن اس سے اس کے مستقل ارادے متزلزل ہونے نہ پائے۔ اسے خود اپنے اور اپنے لوگوں پر کافی سے زیادہ اعتماد تھا اور اسے یقین تھا کہ عربوں میں تعلیم کی صلاحیت ہے بشرطیکہ ان کی مناسب رہبری کی جائے۔ اسے سارے عرب پر حکومت کرنے کی دھن تھی اور اسی دھن میں وہ توپوں کے منہ پڑھزار ہا سپاہیوں کا مقابلہ کرنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ خدا کا خوف ہمیشہ اس کے دل پر رہا۔ وہ مسلمانوں کو متحد کر کے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا۔ ”الاخوان“ اس کے خیالات کا ایک علی نمونہ تھا۔

ابن سعود کے دشمن اس کے مقاصد سے متعلق شکوک رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ مذہب کی آر میں دنیا داری کر رہا ہے اور مذہب کو اپنا حربہ آلود کار بنا رکھا ہے۔ حتیٰ کہ ریاض کے بعض علماء بھی ابھی تک اس کے متعلق شک کرتے تھے تاہم کسی کو اس کے خلاف منہ ہلانے کی گنجائش نہ تھی۔ کیونکہ مذہبی احکامات کی پابندی میں وہ علماء سے کسی طرح کم نہ تھا۔ پانچ وقت کی نماز

مسجد میں ادا کرنا، شراب و تنباکو سے اجتناب کرنا، روزے رکھنا، خیرات دینا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا — یہ سب اس کے اہم اور ضروری مشغلے تھے۔

بچپن ہی سے ابن سعود باپ کی نگرانی اور تعلیم کے باعث مذہبی آدمی بن گیا تھا۔ عام جلسوں میں، تنہائی میں، میدان جنگ میں، کھلے ریگستان میں، خیمہ میں — ہر جگہ اسے خدا کے جلوے نظر آتے تھے۔ وہ اسی پر سب سے زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ ہر مسئلہ پر نہایت خشوع و خضوع سے غور کرتا اور بھلائی کے لیے خداوندِ کریم سے دعا مانگتا تھا۔ مذہب اور سیاست اس کے پاس دو علیحدہ چیزیں نہ تھیں بلکہ ایک اور بالکل ایک۔ وہ کہا کرتا تھا۔ ”میں اول تو مسلمان ہوں اور پھر عرب کا رہنے والا۔ خداوندِ کریم کا ایک ادنیٰ بندہ“

ابن سعود کے دشمن اس کے متعلق بہت کچھ کہا کرتے تھے لیکن اس کے خلوص کے متعلق کسی کو زبان ہلانے کی گنجائش نہ تھی۔ ساتھ ہی اس کے اسے اپنے لوگوں پر کامل بھروسہ تھا اور اسے اس بات کا پورا یقین تھا کہ اگر اہل عرب کی تنظیم کی جائے تو وہ بہتر سے بہتر کام کر سکتے ہیں چنانچہ ایک دفعہ اس نے قلبی سے حسین کے خلاف گفتگو کرتے ہوئے کہا

”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اگر میں صرف زبان ہلا دوں تو

ہر حصہ سے لوگ جوق در جوق آکر میرے جھنڈے کے نیچے جمع ہونگے۔ ہر شخص اس بات سے آگاہ ہے کہ زندگی سے موت بہتر ہے اور ہر ایک اس گرانقدر انعام کے لیے زندہ ہے۔ ہر ایک شخص جانتا ہے کہ اس معاملہ میں پیچھے ہٹنا یا پس و پیش کرنا جہنم کی آگ کے لیے تیار رہنا ہے۔“

اس کے اور الاخوان کے اعتقاد<sup>۱</sup> میں کوئی فرق نہ تھا البتہ وہ

لے الاخوان کے شعلق اس سے پیشتر کے کسی باب میں تفصیلی معلومات دی گئی ہیں۔ ”یہ غازیوں اور مجاہدوں کا ایک گروہ ہے۔ یہ توحید پر مرجانے والوں اور جان دینے والوں کی جماعت ہے جو محبت و مصیبت دینی میں نہایت شدید ہے“ ان کا نعرہ مجاہدانہ یہ ہے عُوْد وَاِلٰی اللّٰهِ اِيْمًا الْمَشْرُكُوْنَ - عُوْد وَاِلٰی النَّبِیِّ وَالسَّنَّةِ عُوْدًا اِلٰی دِیْنِ التَّوْحِیْدِ لِحَنِّ الْاِخْوَانِ عَلَیْكُمْ ..... اِنْ سَیْفِنَا تَبَارَوْ لَوْ عَنَّا عَصِیْب - (پلٹو اللہ کی طرف اے مشرک! پلٹو نبی اور سنت کی طرف۔ پلٹو دین توحید کی طرف۔ ہم تم پر مسلط ہیں ..... ہماری تلوار تیز اور ہماری لڑائی کٹھن ہے۔) اس جماعت کا نعرہ جنگ یہ ہے۔ هُبَّتْ هُبُوبُ الْجَنَّةِ اِیْنِ اَنْتَ یَا بَاغِیْمَا (جنت کی ہوائیں آرہی ہیں، اے کہ تو اس کا آرزو مند ہو کہ دھر ہو) تاریخ نجد از سلم حیرا پوری۔<sup>۲۳۶</sup> یہ جماعت بلاشبہ ایک زبردست طاقت کی مالک ہے۔ البتہ اس کی ابتداء میں تنظیم کم تھی جس کے باعث انہوں نے بعض ایسی غلطیاں کیں جن کو اسلامی دنیائے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا لیکن اب ابن سعود نے اس کو بہت کچھ منظم کر لیا ہے اور اُنے دن اس خدا پر جان مینے والی جماعت میں اضافہ کر دیا ہے۔

مذہب کے اندھے تھے اور غلطیوں کے مرتکب ہوتے تھے اور یہ ہوشیاری سے کام کرتا تھا۔ ایک مرتبہ دویش نے انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کی صلاح دی۔ ابن سعود نے سرکار کا یہ حکم سنا کر صاف انکار کر دیا کہ اگر فتح کا پورا یقین نہ ہو تو جہاد نہ کرو۔ اسی طرح ریاض کے علماء بھی اسے طرح طرح کے مشورے دیتے اور غیر مالک کے باشندوں سے تعلقات منقطع کرنے کے لیے اسے مجبور کرتے تھے، لیکن ابن سعود جہاں تک مذہب کا تعلق تھا ان کی سنتا تھا اور جب کوئی سیاسی مسئلہ ہوتا تو اس سے صرف اس وقت متفق ہوتا تھا جب کہ اس میں کوئی جان ہو۔ ابن سعود کی یہ فطرت ثانی ہو گئی تھی کہ وہ ہر بات کو پہلے عقل کی ترازو میں تولتا تھا اور پھر اس پر عمل کرتا تھا۔ چنانچہ کئی لوگوں نے اسے خلافت کے لیے کہا، اکثروں نے اسے امام مہدی کے فرائض انجام دینے کو کہا۔ مگر ابن سعود ایسا اوجھانہ تھا جو ایسی فضول باتوں پر کان دھرتا۔ وہ ب کی سنتا اور خاموش اپنا کام کرتا تھا البتہ حسین کو شکست دے کر مکہ کی مقدس سرزمین کو برائیوں سے پاک کرنے کے متعلق وہ اپنے لوگوں کا ہم نوا اور بذات خود اس کے لیے سخت کوشاں تھا۔

ان سب باتوں کے علاوہ ابن سعود شریعت کے دامن کو ہاتھ سے چھوڑنا کسی قیمت پر گوارا نہ کرتا تھا۔

— ۱۶ —

ابن سعود نے حسین پر حملہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا لیکن اس

سلسلہ میں ابھی کوئی علی قدم آگے نہیں بڑھایا کیونکہ حجاز کو حاصل کرنا، احساء، حائل اور شمر پر حملہ کرنے کی طرح آسان تو نہ تھا۔ کیونکہ کئی اعتبار سے اس خطہ پاک کو بین الاقوامی اہمیت حاصل تھی، یہ مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ قابل احترام سرزمین اور اللہ کا گھر تھا، ہر مسلمان اس سے خاص لگاؤ رکھتا ہے۔ اگر دنیا کے مسلمانوں کی مرضی کے خلاف ابن سعود حجاز کو اپنی قوت بازو سے فتح کر لیتا تو تمام عالم اسلامی کے نزدیک یہ فعل ہرگز ہرگز مستحسن اور قابل قبول نہ ہوتا۔ اسی لیے سب سے پہلے ابن سعود نے علی الاعلان اس امر کا اظہار کر دیا کہ جب تک سارا عالم اسلامی حسین کو اپنا خلیفہ تسلیم نہ کرے، وہ کبھی اس کی خلافت کو تسلیم نہیں کریگا۔

عرب کی حد تک حسین کے متعلق غور و خوض کرنے کے لیے ابن حو نے ایک کانفرنس منعقد کی جس میں عرب کے تمام قبائل کے علماء، شیوخ اور سردار جمع ہوئے۔ عبدالرحمن نے اس جلسہ کی صدارت کی ابن حو بھی کسی خاص اعزاز یا شان و شوکت کے بغیر اس جلسہ میں شریک تھا۔ کارروائی شروع ہوئی اور ایک ایک کر کے تمام علماء اور شیوخ نے حسین پر حملہ کرنے کی صلاح دی اور استدلال میں یہ بات پیش کی کہ گذشتہ دو سال سے کسی واپسی کو حج کا موقع نہیں ملا تھا۔ الانحوان تو بس جنگ کے لیے مر رہے تھے۔

ابن سعود اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا ہوا سب سن رہا تھا لیکن جب

حسین پر فوری حملہ کرنے کا تصفیہ ہونے لگا تو پھر اس نے مخالفت شروع کی اور کہا کہ جب تک سارا عالم اسلامی خلافت کے بارے میں اپنی رہے نہ دے لے، حسین پر حملہ کرنا بے فائدہ ہوگا۔ اس مقصد کے لیے اس نے اپنے لڑکے فیصل کی دستخط سے، تمام بلاد اسلامیہ میں، حسین کے واقعات — اس کی سختیاں، اس کی نا انصافیاں، اس کے مظالم، اور اس کی خود غرضیوں وغیرہ کو لکھ بھیجا اور شور طلب کیا۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں سے عقائد کی موافقت یا مخالفت کے اعتبار سے مختلف النوع جواب آئے۔ بعضوں نے حسین کی موافقت کی، اکثروں نے اس کی مطلق العنانی اور ظلم و ستم کے لحاظ سے اس کی مخالفت کی، بہر حال اکثریت حسین کے خلاف تھی اور ابن سُبُکْتِیْن سے اس امر کی متمنی تھی کہ وہ حجاز کو حسین کے جوئے سے نکال کر آزاد کر دے تاکہ حجاج کو جبین و اطمینان نصیب ہو۔ رہا خلافت کا سوال، تو اس کے متعلق دنیا کے تمام مسلمانوں نے حسین کی مخالفت کی اور وہ اب بھی سلطان عبد الحمید خاں ہی کے موافق تھے اور جائز حق دار سمجھتے تھے۔

— (۷) —

اب تمام حالات ابن سعود کے موافق تھے، حسین تنہا تھا، انگریز بھی اس سے بیزار آگئے تھے، وہ اپنے لڑکوں کی بھی بہت کم سنتا تھا جس سے وہ بھی بدظن ہو گئے تھے۔ ان حالات کی تحت

ابن سعود کے مشیروں نے شدت کے ساتھ حملہ کرنے پر زور دیا۔ کامیابی  
ناگزیر تھی۔

ابن سعود حملہ کے متعلق اپنے خاص منصوبے رکھتا تھا۔ وہ پہلے  
خما اور ترابہ کی طرف سے سیدھے مکہ اور جدہ اور پھر وسط حجاز پر  
حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ عبد اللہ اور فیصل کو روکنے کے لیے اس نے  
ایک فوجی دستہ عراق کی سرحد پر روانہ کیا اور ایک دوسرا فوجی دستہ  
جوف سے وادی شیریں کی طرف اور ایک دوسرا دستہ مدینہ اور  
دمشق کے درمیان ریلوے پٹری کی جانب۔ سلطان ابن بجاوشیخ غتیبہ  
کو حجاز کی سرحد پر بھیجا کہ وہاں وہ ہنگامہ مچائے اور لوئی کو خما سے  
سیدھے مکہ کی طرف حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔

خما سے پرے شہر طائف واقع تھا، یہ بڑا ہی خوش نما اور  
خوش منظر شہر تھا، یہاں ایک قلعہ اور کچھ فوج تھی۔ اس کی فہمیل بڑی  
مضبوط تھی۔ یہ شہر حسین کا تفریح گاہ تھا اور جب مکہ میں زیادہ گرمی  
ہوتی تو حسین یہاں آکر قیام کرتا تھا۔

لوی کو اطلاع ملی کہ آج کل حسین کا بیٹا علی جو اس کی فوج کا  
کمانڈر تھا، تفریح کی غرض سے طائف آیا ہوا ہے۔ لوی نے بجا کو  
اس کی اطلاع کردی اور بجا نے فوراً جتنی بھی فوج مل سکی، جمع کر کے  
طائف پر حملہ کر دیا۔ علی کوئی ایسا اچھا سپاہی نہ تھا، شہر کے دروازے  
کھلے چھوڑ کر وہ بھاگ نکلا۔ چو طرف سے الاخوان ٹوٹ پڑنے لگے۔

اس اثناء میں علی نے ہذا پر اپنی فوج جمع کر لی اور مقابلہ کے لیے تیار نہو گیا لیکن الاخوان اس زور سے دھاوا بول رہے تھے کہ علی کی فوج کے پیر میدان سے اُکھڑ گئے اس طرح علی کی فوج کو درہم برہم کر کے الاخوان نے سیدھے مکہ کا رخ کیا۔

یہ خبر جو مکہ کو پہنچی تو ایک دھوم سی مچ گئی۔ لوگ گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اکثر لوگوں نے اپنا گھربار چھوڑا اور کچھ ضروری سامان لے، جدہ کا رخ کیا۔ بے شمار لوگ ہر اسان اور بدحواس تھے۔ ان کے دلوں پر الاخوان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔

حسین بھی بزدل نہ تھا بلکہ وہ سعودیوں کے خلاف مرتے دم تک لڑنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے اپنے لڑکے علی کو جدہ روانہ کر دیا اور اپنے لوگوں کے پاس پیغام بروں کو دوڑایا کہ وہ حملہ کی مدافعت کریں کسی نے امداد نہ دی۔ خود اس کے ملازم اور سپاہیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا البتہ اس کے چند رشتہ داروں اور غلاموں نے ساتھ دیا۔

ابھی وقت تھا۔ جدہ اور مکہ کے درمیان رستہ کھلا تھا۔ حسین کے مشیروں نے صلاح دی کہ وہ اپنے لڑکے کے حق میں تخت سے دست بردار ہو جائے تاکہ مکہ لوٹ مار سے بچ سکے۔ جدہ کا ناظم کروڑ گیری طویل حسین کا بے حد دوست تھا۔ حسین اس کی بہت سنا تھا۔ طویل نے حسین کو دست برداری کی صلاح دی۔



لیکن حسین کے دماغ میں بادشاہت کا جنون زور پکڑ رہا تھا۔ دوست احباب اور مخلصوں کے مشوروں سے غصہ کے مارے وہ جھنجلا گیا اور سب کو تلخ جواب دیا۔ رشتہ داروں نے اس سے التجا کی کہ خدا را ایسے نازک موقع پر سنجیدگی سے کام لیجئے۔ اہل شہر نے رُو رُو کر استدعا کی لیکن اب بھی حسین اپنی بات پر اڑا رہا۔ یہ حال دیکھ کر شہری اس کے محل کے اطراف جمع ہو گئے اور یہ طے کر لیا کہ حسین کو پکڑ کر دشمنوں کے حوالہ کر دیا جائے اور اس کی جمع کردہ دولت لوٹ کر حصے بخرے کر لیے جائیں۔

اب تو حسین کو تخت چھوڑتے ہی بنی۔ حسین نے بادلِ ناخوستہ مجبور ہو کر دست برداری کا اعلان کر دیا۔ اس کے پاس بارہ موٹیں تھیں۔ ان میں اپنا تمام قیمتی اثاثہ بھر کر سیدھے جدہ چلا گیا پھر وہاں سے ایک جہاز کے ذریعے عقبہ ہوتے ہوئے جزیرہ سائپرس پہنچا۔

(۸)

الاخوان کی اس مہتم بالشان کامیابی پر سب سے زیادہ حیرت ابنِ سعود کو ہوئی۔ اسے یقین تھا کہ آخری لمحہ میں بھی انگریز حسین کو مدد دیں گے۔ اسے ہرگز ہرگز امید نہ تھی کہ وہ دشمن سے اتنا جلد پسپا ہوگا۔

علی نے مکہ آکر ابنِ سعود کی مدافعت کے لیے بہت کچھ انتظام کیا لیکن اس سے کچھ خاطر خواہ تشفی نہ ہوئی کیونکہ مکہ اور اطرافِ مکہ

کے لوگ بہت بدول ہو گئے تھے اور الاخوان کے نام سے کاٹتے تھے۔  
 علی بھی ابن سعود سے مصالحت کرنے کا خواہاں تھا کیونکہ وہ چٹکے نہیں  
 بلکہ مافیت پسند تھا لیکن طویل کے اکٹانے پر وہ مدافعت کے لیے  
 راضی ہو گیا۔ علی نے اس کے بعد انگریزوں سے امداد طلب کی لیکن  
 انگریزوں نے مذہبی جنگ قرار دے کر امداد سے صاف انکار کر دیا۔  
 انگریزوں کا یہ جواب سن کر علی نے ابن سعود سے صلح کی درخواست  
 کی۔ لیکن ابن سعود اس پر راضی نہیں ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ حجاز کی  
 سرزمین میں حسین کے خاندان کا ایک بچہ بھی بچ رہیگا تو چین نصیب  
 نہیں ہو سکتا۔ اس نے بجاد اور لوتی کے ساتھ اپنے چند سپاہی  
 روانہ کیے اور ہدایت کی کہ طائف کی طرح لوٹ مار نہ کی جائے اور  
 اگر کوئی بد عنوانی ہوگی تو اس کے ذمہ دار بجاد اور لوتی ہوں گے۔  
 بجاد نے مکہ کے باہر ڈیرا ڈال دیا اور اپنے چار سپاہیوں کو زائرین  
 کے لباس میں غیر مسلح شہر کے اندر بھیجا۔ مکہ میں کامل سکوت تھا بازار  
 اور مکان بند پڑے تھے۔ ان چاروں سواروں نے باواز بلند  
 شہر کی گلی کوچوں میں پھر پھر اعلان کر دیا کہ

خدا کے فضل سے سب کو جان کی امان ہے

ابن سعود تمہارا حکمران ہے

دوسرے دن لوتی نے دہزار سپاہیوں کے ساتھ مکہ پر قبضہ

کر لیا۔ تو وہی کٹا دہائی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اہل مکہ کے ساتھ بھی وہی کیا جائے جو طائف والوں کے ساتھ کیا گیا۔ لیکن ابن سعود کی نافرمانی سے ڈر کر اس نے ضبط سے کام لیا۔ اس پر الاخوان جماعت کے لوگوں نے مساجد اور مقابر پر جو زیارتی اشیاء تھیں ان کو فوراً بکال دیا۔ توئی نے انہیں اس سے زیادہ اجازت نہ دی۔

اس کے بعد مکہ کی اطراف کے قبائل نے ابن سعود کی بلاچوں و چراطاعت قبول کر لی۔ البتہ دو ایک قبیلوں نے کچھ مخالفت کی لیکن الاخوان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے آخر انہیں بھی سر جھکانا ہی پڑا۔

بندر گاہ جدہ اور منبوع اور شہر مدینہ — یہ تینوں اچھی طرح محصور تھے۔ یہاں کے باشندوں نے اطاعت سے انحراف کیا۔ ان کے علاوہ تمام حجاز پر ابن سعود کا قبضہ ہو گیا۔

اس فتح کے بعد ابن سعود ریاض پہنچا، ایک عظیم الشان جلسہ کیا اور اپنی فتوحات کی اطلاع تمام بیرونی ممالک کو کرائی اور یہ لکھ بھیجا کہ

”اب نا انصافی اور غاصبیت کا دورہ ختم ہو چکا ہے، ہماری حقیقی آرزو یہ ہے کہ اسلام کی مقدس سر زمین تمام مسلمانوں کے لیے کھلی رہے۔ اور مقامات مقدسہ کی کارروائیوں کا تصفیہ خود سب مسلمان بیٹھ کر کر لیں۔“

ہم خود مکہ جائینگے اور ہماری یہ خواہش ہے کہ ہمارے  
تمام مسلمان بھائی بحث و مباحثہ اور تصفیہ کے لیے  
اپنے اپنے نمائندے روانہ کریں۔

اس کے بعد ابن سعود اپنے بیٹے سعود کو ریاض میں اپنا قائم  
مقام بنا کر خود علماء، شرفاء، وزراء اور سردارین عساکر وغیرہ کو  
لے کر مکہ کا رخ کیا۔ یہ سفر بہت آہستگی سے طے ہوا اس لیے کہ راستہ  
میں اہل قبائل آ کر اس سے ملتے، اس کی کامیابی پر مبارکباد دیتے  
اور اپنی وفاداری کا ثبوت دے رہے تھے۔ چودھویں دن ابن سعود  
نے اپنے مشیر خاص حافظ وہبہ اور وزیر خارجہ دو لوجی کو استقبال  
کے لیے آگے روانہ کر دیا۔

پندرہویں دن وہ مکہ معظمہ پہنچا۔ قریب پہنچ کر اس نے احرام  
باندھ لیا۔ کھڑا ویں پہن لیے اور برہنہ سر، غیر مسلح عرفات کی پہاڑی  
اور پھر وادی ابطح اور معابدہ کی ریتلی سڑک سے ہوتے ہوئے  
مکہ معظمہ پہنچا۔ اس کی زبان پر یہ کلمات طلبیہ جاری تھے۔

لَبَّيْكَ اللَّهُمَّ لَبَّيْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ لَبَّيْكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنَّعْمَةَ  
وَالْمُلْكَ لَا شَرِيكَ لَكَ

قبرستان معلیٰ کے پاس لودی اس سے آگے۔ لودی کے ساتھ وہ شہر میں  
داخل ہوا۔ اہل شہر نے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیے اور باہر آ کر  
ابن سعود کو دیکھنے لگے۔ ابن سعود سیدھے جامع مسجد پہنچا اور وہاں جا کر ارکان حج کا

# تیرہواں باب

## حجاز کی فتح

(۱)

مکہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد ابن سعود نے حجاز کی مقدس سرزمین اور سارے عرب کی تنظیم جدیدہ کا بیڑہ اٹھایا۔ حجاز کے علاوہ دوسرے علاقوں میں وہ اپنی مرضی کے موافق نظم و نسق قائم کر سکتا تھا لیکن حجاز کا معاملہ ساری دین کے مسلمانوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اگر اس کے نظم و نسق میں ذری بھی فروگزاشت ہو جاتی تو دنیاۓ اسلام میں ایک ہنبلکہ مچ جاتا اور اس کی شہرت اور نیک نامی پر پانی پھر جاتا۔ اسی لیے حجاز کی حد تک ابن سعود اپنی طبیعت کے خلاف پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا کہ مبادا کوئی غلطی سرزد نہ ہو جائے۔

اس سلسلہ میں ابن سعود کو بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کی دعوت پر مختلف ممالک سے مسلمان نمائندے آئے اور

غصہ میں بھرے ہوئے آئے۔ وہ پہلے ہی سے وہابیوں کے عقائد کے خلاف تھے، شریف مکہ کے پروپاگنڈے نے آگ پر پانی کا کام کیا اور دنیائے اسلام کا بیشتر حصہ ابن سعود کے خلاف ہو گیا۔ چنانچہ ایران اور عراق کے اہل تشیع نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی کہ مکہ پر وہابیوں کا قبضہ ہو گیا، حج و زیارت میں تکلیف ہوگی، یہ لوگ بڑے جاہل اور سخت ہیں، طائف میں انہوں نے وہ دھوم مچائی، تو ریب کو ویسا تباہ کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مکہ کے گنبد ڈھادئے! بن حوڑ نے ان سب باتوں کو سنا اور ان لوگوں کے اعتراضات پر بھڑک اٹھنے کی بجائے اس نے سنجیدگی سے کام لیا اور معترضین کو حجاز آکر صفائی کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ ایران سے کئی لوگ آئے، پہلے ان کا طور بہت مخالفانہ رہا لیکن ابن سعود نے جب واقعات کی تفہیم کی تو وہ مطمئن ہو کر اپنے وطن واپس چلے گئے۔

مصر سے بھی کئی نمائندے اسی غرض سے مکہ آئے۔ مصری بڑے نقاد اور لڑاکو واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے اعتراض کیا کہ حسین کی زبانی معلوم ہوا کہ الاخوان مدینہ کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں اور نعوذ باللہ گنبد خضرا پر ہاتھ ڈالنے والے ہیں۔ اور دونوں کو لوٹنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ابن سعود نے بتایا کہ واقعات سب غلط بیان کیے گئے ہیں۔ یہ سب شریف حسین کی ریشہ دوانی ہے۔ حالانکہ واقعات بالکل مختلف ہیں۔ مصریوں کو اطمینان ہو گیا اور

وہ خوشی خوشی اپنے وطن سدھارے ۔

اس کے بعد ہندوستانی علماء کا گروہ پہنچا ۔ ہندوستانی علماء نے مذہبی نہیں بلکہ سیاسی خیالات سے بھی متصف تھے۔ ان کے اور ابن سعود کے مابین زور دار مباحثہ ہوا لیکن دونوں کسی سنجیدہ فیصلہ پر نہ پہنچ سکے لیکن ساتھ ہی اس کے دونوں ناراض بھی نہیں ہوئے ۔

ترکی سے شیخ منموئی آئے۔ یہ بہت بوڑھے اور سخت مذہبی آدمی تھے۔ لوگ ان کا بڑا احترام کرتے تھے اور دنیا میں ان کے معتقدین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ انہوں نے وہابیوں پر اعتراضات کی بوچھاڑ کردی اور خوب ہجو کی۔ وہابی اس پر حد درجہ مشتعل ہو گئے، قریب تھا کہ کوئی جھگڑا ہو جاتا لیکن ابن سعود نے نہایت ہوشیاری سے اس معاملہ کو رفع دفع کر دیا۔ اس طرح ابن سعود پر چوہرے سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی لیکن وہ خاموشی سے اپنے منصوبے گھڑنے لگا مخالفین نے یہ سمجھا کہ شاید ابن سعود اپنے کیے پر پشیمان ہے۔

ابن سعود نے پھر حجاز میں ایک عارضی حکومت قائم کر دی اور اس پر ایک کمیشن مقرر کر کے اس کا صدر اپنے دوسرے لڑکے فیصل کو بتایا۔ لڑکی کے ذمہ فوج کردی اور حافظ وہبہ کو سیول گورنر مقرر کیا، اس کے بعد جدہ، یمنوع اور مدینہ کی

حسین اور ابن سعود کی باہمی نزاع سے متعلق انگریزوں کا خیال تھا کہ اس جھگڑے میں دونوں کی قوت کمزور ہو جائیگی لیکن حسین کی حیرتناک اور غیر متوقع ناکامی نے انگریزوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اس موقع پر انگریزوں نے کسی نہ کسی طرح کا مہا ہڈ کر لینا ہی مناسب سمجھا۔ اس غرض کے لیے انہوں نے سر گلبرٹ کلے ٹن کی زیر صدارت ابن سعود کے پاس ایک وفد روانہ کیا۔ اس سے قبل انگریزوں نے شہر عقبہ کے اطراف کچھ حصہ پر قبضہ کر لیا جو حجاز کے شمال میں واقع ہونے کے علاوہ سوئز اور مصر کا رستہ بھی ہے۔ ابن سعود نے اس وفد سے مکہ اور جدہ کے درمیان مقام تجرہ پر اپنے جنگی خیمہ میں ملاقات کی۔ ابن سعود نے نہایت اطمینان کے ساتھ اس وفد سے بحث کی، وہ سب باتوں سے اچھی طرح واقف تھا، چپکے سے وادی شیریں کے شمال میں اپنی فوجیں بھیج دیں اور وہاں ایک مخصوص حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اس حصہ پر قبضہ ہو جانے سے انگریزوں کے منصوبے برابر ہو گئے۔ وہ اسی چیز کو نہیں چاہتے تھے کیونکہ اس سے ابن سعود کو بحر متوسط کی طرف رستہ مل گیا اور فلسطین کو بھی ایک طرح کی دھمکی ہو گئی۔ انگریز بغداد اور پھر ہندوستان تک



ہوائی رستہ بنانا چاہتے تھے۔ اور موصل سے حیفہ تک انگریزی فوج کے لیے تیل کی نہر نکال لانا چاہتے تھے۔ لیکن ان سب منصوبوں پر پانی پھر گیا۔

کلہ ٹن نے اس موقع پر ایک چال چلی۔ اس نے کہا کہ انگریز اور فرانسیسیوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ ابن سعود کو اس حصے سے ہٹا کر نجد کے علاقہ کو ذرا پیچھے ہٹادیں۔ یہ گویا ابن سعود کو کھلی دھکی دی جا رہی تھی۔ اب تک وہ خذہ پیشانی سے ہم کلام تھا، اب اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ اس نے اپنے لوگوں پر ایک نظر ڈالی۔ سب جنگ کے لیے تئیں کھڑے تھے۔ اگر چاہتا تو سب لوگ خوشی سے انگریزوں کے خلاف میدان میں اتر جاتے۔ مگر یہ فعل سراسر عقلمندی کے خلاف تھا۔ انگریزوں کی قوت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ جدہ، ینبوع اور مدینہ ابھی اس کے قبضہ میں نہ تھے۔ اس کے علاوہ بغداد میں فیصل اور اس کا بھائی عبداللہ دونوں اس پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے اور حسین کی طرف سے کسی نہ کسی طرح انہیں امداد پہنچ رہی تھی۔

ایک لمحہ میں یہ سب حالات ابن سعود کے آگے آگے وہ مسکراتے ہوئے کلہ ٹن کی طرف پلٹا، اور اس حصہ سے کنارہ کشی منظور کر لی۔ اس کے بدلہ میں انگریزوں نے اسے وادی شیریں اور ردئیلہ قبائل کا مختار تسلیم کیا۔

حسین کا بیٹا علی ابن سعود کی آنکھوں میں کانٹا بن کر ٹک رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد سے جلد سارے حجاز کو اپنے قبضہ میں لائے۔ اس نے پھر ایک مرتبہ دنیا کے تمام مسلمانوں سے حجاز کے نظم و نسق سے متعلق مشورے طلب کیے اور اس موضوع پر گفتگو کرنے کے لیے انہیں حجاز آنے کی دعوت دی۔ ایک سال تک کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ابن سعود نے پھر سے دعوت کی تجدید کی۔ اس مرتبہ بعض ممالک نے صاف انکار کر دیا، بعض نے کچھ بہانہ کیا اور چند نمائندے جو آگئے انہوں نے طرح طرح کے بے معنی اعتراضات شروع کر دیے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کسی چھوٹے مسئلہ پر بھی متفق نہ ہو سکے ان کا زیادہ تر وقت غیر حقیقی اور بے بنیاد اختلافات کی نذر ہو گیا۔ اس کے باوجود ابن سعود نفاق پیدا کرنے کو گناہ سمجھتا رہا اور اس بات کا آرزو مند تھا کہ اسلام میں ایک اتحاد پیدا ہو جائے چنانچہ اسی سلسلہ میں اس نے ایک عام جلسہ میں قرآن حکیم کی ایک آیت بے ساختہ تلاوت کی جس کا منشا یہ ہے کہ ”خدا کے حکم کی حتمی سے تعمیل کرو اور علیحدہ مت بنے خدا نے اپنے فضل سے مسلمانوں کو اسلام اور نبی، عطا فرمایا“ ابن سعود کے ساتھی بھی ان باتوں سے بیزار آگئے تھے، وہ کہتے تھے کہ حجاز کو ہم نے اپنا خون بہا کر آزاد کرایا ہے،

پھر کیا وجہ ہے کہ دوسروں سے اس کے متعلق گفتگو کی جائے جب کہ وہ خود اس معاملے کی یکسوئی کرنا نہیں چاہتے ؟ علماء و ہائی الاخوان اور نجد کے تمام جاں نثار ، حجاز کو سوائے ابن سعود کے کسی دوسرے کے ہاتھ میں دینا نہیں چاہتے تھے ۔ خود حجازی بھی اس کے لیے راضی نہیں تھے ۔ بالخصوص جب ہندوستان کی طرف سے حجاز میں بین الاقوامی جمہوریت قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تو ابن سعود ، نجدی اور حجازی سب کے سب بھڑک اٹھے اور ابن سعود نے تصفیہ کر لیا کہ یہ بحث فضول ہے ، وہ خود بادشاہ بن کر ملک کے سارے انتظامات خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا اور انگریزوں کا مقابلہ کر سکتا ہے ، چنانچہ اس نے اپنے ایک مہمان سے کہا

” اس کا یقین کر لو کہ میرے ملک میں کوئی بیرونی حکومت اپنا سکہ جمانہیں سکتی ۔ خدا کے فضل سے میں خود ، خود مختار نہ حیثیت سے حکومت کر سکتا ہوں ۔

” میں نے اس مسئلہ پر کافی غور کیا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ کسی جگہ کے بھی مسلمان حجاز کی خود مختاری کی ضمانت نہیں دے سکتے ۔ ہندوستانی انگریزوں کے ماتحت ہیں ، شامی فرانسیسیوں کے زیر اثر و ہوا ہذا ۔ اگر میں حکومت کی باگ

ان کے ہاتھ میں دیدوں تو اس کا صریح نتیجہ یہ ہوگا  
 کہ باہر کی عیسائی اقوام ہماری مقدس سرزمین پر  
 اپنے آدمیوں کے ذریعہ حکومت کریں گی۔  
 ”میں نے خدا کی مدد سے، اپنی قوت بازو سے  
 اور اپنے ساتھیوں کی جان نثاری سے فتح حاصل  
 کی ہے۔ صرف میں ہی اس سرزمین کو ایک آزاد  
 اسلامی سلطنت کا رنگ دے سکتا ہوں یہ میرا حق  
 اور فرض ہے کہ میں بادشاہ بنوں۔“  
 اس کے بعد ابن سعود نے دنیا کے تمام مسلمانوں کے پاس  
 ایک پیغام بھیجا جس میں لکھا تھا کہ  
 ”حجاز پر حکومت کرنا یا اس کا مالک بن بیٹھنا میری  
 خواہش نہیں ہے حجاز میرے ہاتھ میں ایک امانت  
 ہے اور یہ اس وقت تک میرے پاس رہے گی جب تک  
 کہ اس ملک کے باشندے اپنے لیے ایک حکمران منتخب  
 نہ کر لیں۔ ایک ایسا حکمران جو اپنے کو مسلمانانِ عالم  
 کا خادم سمجھتا ہو۔“  
 ابن سعود کے سوا دوسرا کون ایسا ہو سکتا ہے؟

— (۴) —

اپنے تئیں یہ تعصیہ کر لینے کے بعد ابن سعود اپنے کام کی

طرف رجوع ہو گیا۔ مدینہ، ینبوع اور جدہ کی فتح کا مسئلہ اس کے پیش نظر تھا۔ ان دنوں دوش ج کے لیے مکہ آیا ہوا تھا ابن سعود اسے گھر واپس جانے کا حکم دیا کیونکہ یہاں اس کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ دوش ذرا آزدہ ہو گیا اور واپس جاتے میں اس نے چند گاؤں پر حملہ کر کے معصوموں اور بیگناہوں کے خون سے اپنے غصہ کی آگ بجھائی، اور فخریہ طور پر اپنی اس کارگزاری کی اطلاع ابن سعود کے پاس بھیجی۔ ابن سعود کو دوش کی یہ تازیبا حرکت بہت بُری معلوم ہوئی اور وہ اسے فوراً واپس چلا جانے کا حکم دیا اور خلاف ورزی کی صورت میں سزا کی دھمکی دی۔ دوش اپنا خون آپ پی کر چلا گیا۔

اس کے بعد ابن سعود نے اپنے لڑکے محمد کو مدینہ روانہ کیا۔ اہل مدینہ نے بغیر کسی مزاحمت کے اس کی حکومت تسلیم کر لی اور پھر بندرگاہ ینبوع کے باشندے بھی ابن سعود کے ماتحت بن گئے۔ اس وقت علی جدہ میں تھا۔ یہ اپنے کو حجاز کا بادشاہ جتلاتا تھا، اس کے ساتھ حسین کی فوج کے تھوڑے سے سپاہیوں کے علاوہ چند شامی اور ترکی افسر بھی تھے۔ علی نے ابن سعود کے مقابلہ کے لیے خندقیں کھدوائیں، فصیل درست کرائی اور دو ہوائی جہاز بھی خرید لیے تھے۔ لیکن علی میں انتظامی قابلیت سرے سے مفقود تھی۔ اس کے ماتحتین کا بھی یہی حال تھا،

اس وقت جدہ میں حجاج بھرے ہوئے تھے۔ کھانے پینے کی سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ علی میں اتنی صلاحیت تو نہ تھی کہ ان امور کا اسناد کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند دن کے اندر قحط پڑ گیا۔ لوگ بڑکوں پر بھوکے مرنے لگے، طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو گئیں اور ایک عام بدحواسی پھیل گئی۔

جس وقت الاخوان نے مدینہ پر حملہ کیا تو علی کے رہے ہیں ہوش پران ہو گئے اور سارے منصوبے خاک میں مل گئے۔ علی نے خاموشی ہی میں خیر دیکھی اور انگریزی جہاز پر سوار ہو کر ڈسمبر ۱۹۲۵ء میں عدن سے ہوتا ہوا اپنے بھائی فیصل کے پاس بغداد پہنچ گیا۔ اس کے بعد ابن سعود نہایت فخرانہ انداز میں مدینہ میں داخل ہوا۔ اہل مدینہ نے اس کی اطاعت قبول کی۔ پھر وہ مکہ معظمہ گیا۔ شرفاء اور علماء نے اس کا استقبال کیا اور کہا کہ حجاز کے باشندے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کرتے ہیں۔ پھر وہ نہایت ترنم و احتشام سے جدہ میں داخل ہوا۔ ابن سعود یہ کروفر اس لیے نہیں کر رہا تھا کہ یورپی تو نصر پر اس کا رعب بیٹھے بلکہ وہ اس لیے نازاں تھا کہ اس نے بے دین، حسین شریف مکہ پر فتح حاصل کی تھی۔ ورنہ وہ ظاہری نمائش اور تکلفات سے طبعاً اجتناب کرتا تھا۔

۸ جنوری ۱۹۲۶ء کو صبح کے وقت وہ باب صفا کے رستے سے

---

---

جامع مسجد میں داخل ہو کر منبر پر بیٹھ گیا، کچھ دیر وعظ کہتا رہا، پھر  
شرفاء و علماء کو بلا کر بیعت لی اور نماز ادا کی۔

اس اثناء میں مسجد کے سامنے ایک بڑا مجمع ہو گیا۔ سب کے  
سامنے اس نے اپنے لڑکے فیصل کو اپنا جانشین قرار دیا اور زیادہ  
قلعہ میں اپنے اعزاز میں ایک سو ایک توپیں دغوائیں۔ اس عمل پر  
اکثر کئے و ہابی چین بہ جبیں ہو گئے حالانکہ اس نے یہ فعل مصلحتاً کیا تھا۔  
اب ابن سعود سارے نجد اور حجاز کا سلطان تھا۔

# پہلو دھواں باب

## اسلامی کانگرس اور مصری محل

ابن سعود اب سارے نجد اور حجاز کا مالک تھا، اس نے یہ محسوس کیا کہ نجد کی حد تک تو کسی بیرونی امداد کی ضرورت نہیں البتہ حجاز کے معاملہ میں دنیا کے تمام مسلمان کا اتحاد ضروری ہے اس نے مکہ میں کانگرس مقرر کی اور تمام سربراہان و مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی۔ اب چونکہ ابن سعود نجد اور حجاز کا سلطان تھا اور اندرونی جھگڑے بھی ایک بڑی حد تک دور ہو چکے تھے اس لیے نمائندوں نے بلا خوف و خطر اس کی دعوت پر لبیک کہا۔

اس موقع پر ممتاز مالک کے کوئی ستر نمائندوں نے شرکت کی۔ ایران یا عراق سے کوئی نمائندہ نہیں بھیجا گیا اور ترکی، یمن، مصر اور افغانستان سے جو نمائندے آئے وہ کچھ دن بعد پہنچے۔



بہر حال ۶ جون ۱۹۲۶ء کو سب نمائندے ایک بڑے ہال میں جمع ہوئے یہ ہال بہت سلیقہ سے سجایا گیا تھا۔ دروازوں پر سبز پردے ڈالے گئے تھے کیونکہ یہ حجاز کا امتیازی رنگ تھا ہال کے ایک حصے میں ایک پلاٹ فارم بنایا گیا تھا جس کے سامنے نمائندوں کے بیٹھنے کے لیے گھڑنعلی وضع کی دو نشستوں کا انتظام کیا گیا تھا کہ نشستوں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔

پہلے اجلاس میں جب سب نمائندے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے، ابن سعود، حافظ وہبہ کے ساتھ بغیر کسی تکلف یا شان و شوکت کے سادگی سے ہال میں داخل ہوا اور سیدھے پلاٹ فارم پر پہنچ کر نمائندوں کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد حافظ وہبہ نے ایک تقریر پڑھی جس کے آخری الفاظ یہ تھے۔

”میں نے آپ حضرات کو حجاز کی اخلاقی اور مذہبی بہتری پر غور کرنے اور اس کے متعلق آپ کے مفید مشورے طلب کرنے کے لیے زحمت دی ہے تاکہ

خدا اور بندگان خدا دونوں خوش ہوں“

اس کے بعد ابن سعود فوراً ہی اسی تیزی سے واپس ہوا جس تیزی سے داخل ہوا تھا۔ اس کے چلے جانے کا مقصد یہ تھا کہ نمائندے دل کھول کر بحث کریں۔ حافظ وہبہ کی تقریر سے ابن سعود کا پورا منشاء ظاہر ہو چکا تھا۔ وہ صرف نمائندوں سے

مشورے چاہتا تھا اور آخری فیصلہ کا حق محفوظ تھا۔ ابن سعود حجاز کے انتظامی یا سیاسی معاملہ میں کسی کی مداخلت نہیں چاہتا تھا کیونکہ پہلی دفعہ جب اس نے نمائندوں کو دعوت دی تھی تو اس کی جداگانہ صورت تھی، اب تو وہ حجاز کا حکمران تھا۔

اس سلسلے میں کئی مباحثے ہوئے۔ اکثر میں ابن سعود نے بھی شرکت کی۔ ابن سعود پر طرح طرح کے سوالات کیے گئے اور وہ ان سب کا جواب دیتا گیا۔ ایک مباحثہ میں ایک نمائندے نے یہ سوال اٹھایا کہ ابن سعود کو سلطان الحجاز بننے کا کیا حق حاصل ہے؟ اس پر ابن سعود نے اس نمائندے کو جواب دیا۔

”کیا آپ میں سے کوئی ایسا ہے جو اس ارض مقدس میں امن قائم رکھنے یا اسے بیرونی حملوں سے بچانے کی ضمانت دے سکتا ہے؟“

اس سوال پر کسی کی گردن نہ اٹھی تو ابن سعود نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”تو پھر میرا فرض ہے کہ یہاں کا سلطان بنوں۔ صرف میں ہی اس سرزمین میں بحیثیت ایک آزاد حکمران کے حکومت کر سکتا ہوں۔“

اس کے بعد ابن سعود نے پھر سے ایک مرتبہ اپنے مافی الضمیر نمائندوں کو آگاہ کر دیا اور کہا

” میں نے آپ کو صرف اس لیے زحمت دی ہے کہ  
آپ حضرات اس ارض مقدس کو اسلامی ہتھیب کا  
گہوارہ بنانے سے متعلق مشورہ دیں۔ اس سے آگے  
جانے کی چنداں ضرورت نہیں۔“

اکثر نمائندوں نے جدہ سے مکہ تک ریل ڈالنے کی صلاح  
دی۔ ابن سعود نے اسے بہت پسند کیا اور خود اس کا انتظام کرنے  
کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کے بعد نمائندوں نے کہا کہ ہم لوگ اپنے  
اپنے ملک سے کثیر رقم جمع کریں گے اور حجاج سے جو آمدنی وصول  
ہوتی ہے اگر وہ بھی ہمارے ہاتھ میں دیدی جائے تو اس مشترکہ رقم  
سے مجازیں اصلاحی کام کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ابن سعود سمجھ گیا کہ یہ سب  
باتیں ہی باتیں ہیں۔ اس نے کہا کہ اچھی بات ہے۔ آپ لوگ  
پہلے اپنے فنڈ جمع کر کے مجھے بتلائیں پھر میں آپ سے حج کی آمدنی  
سے متعلق گفتگو کروں گا۔

ابن سعود کو پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی کہ یہ نمائندے خود آپس  
میں عمر بھر تک متفق الحیال نہیں ہو سکتے۔ ایسا ہی ہوا۔ کانگریس کے  
اجلاس کیا ہوتے تھے، اچھا خاصا ڈنگل بن جاتا تھا۔ اس کی وجہ  
یہ تھی کہ نمائندے اصل مقصد سے ہٹ کر جزئیات پر زور دیتے  
اور اپنی کے تصفیہ میں الجھے رہتے تھے۔ چنانچہ ترکی نمائندہ کے  
دیر سے آنے کی وجہ سے مجازی نمائندہ کو کرسی صدارت دی گئی تھی۔

جب ترکی نمائندہ آگیا تو مطالبہ کیا گیا کہ مجازی کو ہٹا کر ترکی نمائندے کو اس کی جگہ دی جائے۔ بعض نمائندوں نے اصرار کیا کہ بحث و مباحثہ اردو یا انگریزی میں ہو تو دوسروں نے عربی کے لیے زور دیا۔ وہابی عقائد کے متعلق تلخ بحثیں ہونے لگیں۔ کانگریس کے انتظامات پر نکتہ چینیاں کی گئیں۔ بعض ممالک نے مطالبہ کیا کہ ہمارے پاس مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے اس لیے کانگریس میں ہمارے نمائندے زیادہ ہونے چاہئیں۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس سے اس کے بجائے کہ کوئی سودمند نتیجہ نکلتا اسی بخش پیدا ہو گئی۔

ابھی یہ قصے چمکے نہ تھے کہ ایک نیا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ حج کا زمانہ تھا۔ مصری قاہرہ سے محل لارہے تھے۔ اس کے ساتھ مصریوں کا فوجی دستہ اور ایک جنگی توپ بھی تھی۔ دستور یہ تھا کہ محل کوچ کے دن وادی البطح سے ہوتے ہوئے قصبہ مینا

لے محل ایک مستطیل ڈبہ ہے جس کے اوپر کا حصہ ڈیرے کے مانند ہوتا ہے، اسے اونٹ پر رکھ کر ہر سال مکہ لایا جاتا ہے، اس کے ہمراہ مسلح مصری فوج اور توپیں ہوتی ہیں۔ اس محل کی اصل یہ ہے آج سے چھ سو سال قبل محمل مصری ملکہ، ملکہ شجرۃ الدر کی سواری تھی۔ اب قدیم دستور کے مطابق مصری حجاج اسے اپنا نشان بنا کر ساتھ لاتے ہیں،

سے گزر کر عرفات کے پہاڑ پر لے جایا جاتا تھا۔ مصری محل کو عرفات لے جا رہے تھے۔ رستہ میں انہوں نے مینا پر قیام کیا کیونکہ ان کے اکثر ساتھی اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے۔ حجاج کا اثر دھام تھا۔ سب کو آسانی سے ایک جگہ جمع کرنا مشکل کام تھا اسی لیے مصری سپاہیوں نے اپنے آدمیوں کو اطلاع دینے کے لیے بگل بجائی۔ وہابی اس پر بگڑ بیٹھے۔ یہ لوگ موسیقی کے سر سے خلاف تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہابیوں کا ایک گروہ محل کے قریب آکر اس کا مضحکہ اڑانا شروع کیا۔ کسی نے کہا یہ بت ہے، مصری باجا بجا کر اس پوجا کر رہے ہیں۔ چند آدمیوں نے محل پر پتھر برسائے۔ مجمع آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ مصری فسر نے وہابیوں کو ہٹ جانے کے لیے کہا لیکن انہوں نے اس کی پرواہ نہ کی اور بدستور پتھر برساتے رہے۔ مصری افسر کو بہت غصہ آیا اور اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک دم گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ جس سے پچیس آدمی اور چالیس گھوڑے ہلاک ہوئے اور ایک کثیر تعداد زخمی ہوئی۔

اس حادثہ کی خبر آن واحد میں چوطف پھیل گئی نجدی اور الانخوان اپنے بھائیوں کو مدد دینے کے لیے جوق درجوق آنے لگے اور دیکھتے دیکھتے مینا میدان کا رزار بن گیا۔ ابن سعود مینا کے باہر اپنے خیمہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ گولیوں

کے چلنے کی آواز سن کر اس نے اپنے لڑکے فیصل کو تیزی کے ساتھ روانہ کیا۔ فیصل نے یہاں آکر دیکھا تو معاملہ بہت اہم اور نازک ہو گیا تھا۔ اس سے کچھ بن نہ پڑی۔ فوراً اس نے اپنے والد کو امداد کے لیے بلا بھیجا۔

ابن سعود نہایت سرعت کے ساتھ موقع پر پہنچ گیا اور مجمع کو چیرتا پھاڑتا ہوا مصری افسر کے قریب جا کر کہنے لگا۔  
 ”تم نے کس حق کی بناء پر یہ قتل و خون کیا۔  
 تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس ملک میں ایک حکومت ہے اور اس کا ایک قانون بھی ہے۔ میں حکمران ہوں۔ اگر تم مجھے اس کی اطلاع دیتے تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔“

ابن سعود غصہ سے کانپنے لگا۔ چاہتا تو مصریوں کا خاتمہ کر دیتا۔ مگر صبر و ضبط سے کام لے کر کہنے لگا۔  
 ”یشیخی کی جگہ نہیں ہے، یہ مقدس سرزمین ہے جس پر کسی کا خون بہایا نہیں جاسکتا۔ تم ہمارے مہمان ہو اور ہماری امان میں ہو ورنہ کبھی کے اپنے کیے کی سزا بھگت لیے ہوتے۔“

یہ کہہ کر ابن سعود نے مصریوں اور الاخوانوں کے درمیان ایک فوجی دستہ چھوڑ دیا اور انتظامات اپنے لڑکے فیصل اور

اور حافظ وہبہ کے سپرد کر کے خود خیمہ کو واپس لوٹ گیا۔  
 مصریوں کی یہ حرکت ابن سعود کو سخت ناگوار گذری۔ وہ مسلمانوں  
 میں اتحاد اور یگانگت پیدا کرنے کا آرزو مند تھا لیکن اس جھگڑے  
 سے اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کے علاوہ کانگریس بھی کچھ زیادہ کامیاب  
 نہ رہی بلکہ محبت اور خلوص بڑھنے کی بجائے اُلٹے جھگڑے پیدا  
 ہو گئے۔

# پندرہواں باب

## اصلاحِ حجاز

————— ( ۱ ) —————

حجاز کے جنوب میں عسیر واقع ہے اور اس کے جنوب میں یمن۔  
یمن پر امام یحییٰ کی حکومت ہے۔ یمن اگرچہ ایک پہاڑی ملک  
ہے تاہم ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے وہاں اچھی بارش ہوتی  
ہے اور وہ زرخیز بھی ہے۔ وہاں کے باشندے بڑے بہادر اور  
جنگجو ہیں۔ برخلاف اس کے عسیر غریب ملک ہے اور خانگی  
جھگڑوں کے باعث اس کی حالت بہت ستیم اور کمزور ہو گئی  
تھی۔ پہلے اس میں ایک ترکی فوج مقیم تھی لیکن تھوڑے دن  
بعد وہ بھی چلی گئی۔ عسیر پر محمد ادیسی کی حکومت تھی، اس کے  
انتقال کے بعد اس کا لڑکا حسن ادیسی جانشین ہوا جو بہت ہی



نا اہل، کمزور اور بدنام شخص تھا۔ حجاز کی فتح کے بعد ابن سعود نے شمال کی جانب سے عسیر پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ جنوب کی طرف سے امام یحییٰ نے اس پر قبضہ جانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس طرح ۱۲۱۶ھ میں اہل عسیر کے آگے یہ سوال پیش ہوا کہ ساتھ دیں تو کس کا؟ ابن سعود کا یا امام یحییٰ کا؟ ابن سعود کا پتہ بھاری تھا۔ اس کی بہادری اور انصاف کے چرچے سارے اقطاع عرب میں عام ہوتے جا رہے تھے۔ اسی لیے اہل عسیر آنکھ بند کر کے ابن سعود کے ساتھ ہو گئے۔

اب مقابلہ ابن سعود اور امام یحییٰ کے مابین تھا لیکن اس وقت دونوں جنگ کے لیے تیار نہ تھے اس لیے انہوں نے آپس میں تصفیہ کر لیا کہ جو حصہ پہلے ہی سے امام یحییٰ کے قبضہ میں تھا وہ تو ویسے ہی بحال رہے اور باقی پر ابن سعود کی حکومت ہو۔ اس طرح کا سمجھوتہ ایک طرح سے ابن سعود کے حق میں مفید ثابت ہوا کیونکہ ریاض سے نکلے ہوئے اسے کوئی دو سال کا عرصہ چھکا تھا، اہل نجد میں ایک طرح کی بدگمانی پھیلتی جا رہی تھی کہ حجاز کی آمدنی کے لالچ میں ابن سعود نجد کو بھولتا جا رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ دولیش نے ابن سعود کے خلاف کارروائی شروع کر دی تھی۔ ہتھملان بھی اسی کا ساتھ دے رہا تھا اور یہ دونوں مل کر آل عثمان کو ابن سعود کے خلاف اکسا رہے تھے۔ نہ صرف یہی بلکہ فیصل بغداد

بھی اپنے بھائی کے ساتھ سرحدی قبائل میں جال پھیلا رہا تھا۔ ابن سعود کے حق میں یہ باتیں سخت مُضر تھیں۔ ان حالات کے تحت عبدالرحمن اور مشیرانِ سلطنت نے ابن سعود کو فوراً ریاض آنے کے لیے لکھ بھیجا۔ ابن سعود امامِ یحییٰ سے معاہدہ کر کے فوراً ریاض پہنچا۔

شہر میں داخل ہونے کے بعد ابن سعود سیدھا دربار کے صیغہ کمرہ میں داخل ہوا جہاں قبائل کے سردار اور دیگر اکابرِ سلطنت جمع تھے۔ ہر شخص ابن سعود پر اعتراضات کرنے کے لیے تلا ہوا تھا لیکن جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا، کمرہ میں سناٹا چھا گیا۔ ابن سعود نے ان کی صورتوں کو دیکھ کر ان کے دلوں کی حالت کا اندازہ لگا لیا اور نہایت سنجیدگی اور متانت سے سب کو خوش آمدید کہا اور حسبِ عادت اپنا سیدھا ہاتھ بڑھا کر گرجتی ہوئی آواز میں تقریر کرنے لگا۔ حجاز کی فتح، حسین کی پسپائی اور حج بیت اللہ کے واقعات نہایت موثر انداز میں بیان کیے۔ یہ سُن کر سب کے شکوک رفع ہو گئے اور سبہوں نے ہم آواز ہو کر ابن سعود کو مبارکباد دی۔ ابن سعود نے مسکراتے ہوئے سب کا شکریہ ادا کیا۔ مجلسِ درخواست ہوئی اور سب لوگ مطمئن ہو کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

اس کے بعد ابن سعود نے چند دن کے اندر اکثر بڑے اور چھوٹے گاؤں کا دورہ کیا اور اہل قبائل سے مل کر ان کے شکوک رفع کرتا گیا۔ اس طرح سے سب لوگوں کو مطمئن کر کے وہ پھر سے مکہ پہنچا تا کہ ضروری امور کا تصفیہ کرے۔

۲۰

حسین شریف مکہ کے زمانہ میں حجاز کی حالت بالکل ابتر ہو چکی تھی۔ ہر طرف لوٹ مار، چوری، ڈاکہ کا بازار گرم تھا۔ مسافر کبھی اطمینان سے سفر نہیں کر سکتے تھے۔ ہر سال کئی حاجی لقمہ اجل بنتے تھے۔ قتل و غارت ایک معمولی سی بات تھی۔ خصوصاً عدم تنظیم کے باعث بے رحم بدویوں کے ہاتھ حاجیوں نے وہ مصیبتیں اٹھائیں کہ عرصہ تک اس کی دہشت دلوں سے محو نہ ہوگی، کیوں نہ ہو؟ جہاں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا وہاں لیٹرے ہی راج کرتے ہیں۔

اسی لیے ابن سعود نے آگے سب سے پہلے مسافرین کی حفاظت اور امن عامہ کا سوال پیش کیا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہر شہر اور ہر گاؤں میں الانخوانی پولیس کے پہرے لگا دیے۔ شرعی سنراؤں کی تفصیل کا اعلان کر دیا گیا اور عوام میں اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا گیا۔ الانخوانی اسمول اور قانون کے معاملہ میں بڑے سخت ہیں۔ قانون کے آگے

وہ شخصیت، اثر، مال و دولت غرض کسی بات کی پرواہ نہیں کرتے۔ قرآن پاک اُن کا قانون ہے اور اس کی پابندی کرنا ان کا مقدس فرض۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس انتظام سے بڑے بڑے لیرے اور بد معاش تک کانپنے لگے اور قافلے ٹوٹنا تو خیر بڑی بات ہے، کسی ڈاکو کی یہ جرات نہیں ہوتی کہ وہ تنہا آدمی پر حملہ کرے۔ ایک وہ زمانہ تھا جبکہ بڑے بڑے قافلے ایک منزل سے دوسری منزل تک جان بستلی میں لے کر جاتے تھے اور کثیر رقم رشوت دینے کے باوجود کوئی شخص یہ توقع نہیں کر سکتا تھا کہ وہ صحیح و سالم اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکے گا۔ لیکن برخلاف اس کے آج ایک شخص تنہا عرب کے کسی خطہ میں بھی سونا اچھالتے ہوئے جاسکتا ہے اور کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ اسے ہاتھ لگائے!

اس انتظام کے بعد ابن سعود نے حاجیوں کو سہولتیں بہم پہنچانے کی طرف توجہ دی۔ بنی حرب حاجیوں سے روپیہ وصول کیا کرتے تھے۔ ابن سعود نے انہیں روک دیا۔ اور خود پیسہ وصول کر کے موٹروں اور اونٹوں کا انتظام حکومت کی جانب سے کرنے لگا۔ سڑکوں کا کام شروع کر دیا گیا، جا بجا پانی کے چشمے بنوائے اور دوا خانے قائم کیے۔ مدینہ اور مکہ میں سماج کی اصلاح کے لیے کمیٹیاں بنائی گئیں اور عام صفائی اور نماز کی پابندی کی نگرانی ان کمیٹیوں کے اراکین کے ذمہ کر دیا۔

گئی۔ بے نمازیوں کے لیے سزا مقرر کی گئی۔ نماز کے وقت دوکاندار اپنی دوکانیں کھلی چھوڑ کر اطمینان سے مسجد چلے جاتے ہیں اور کیا مجال کہ ایک رتی بھی اِدھر سے اُدھر ہو جائے۔ کیا آج دنیا کی کوئی متمدن قوم دیانت یا حسن انتظام کا کوئی ایسا نمونہ پیش کر سکتی ہے؟

سب سے پہلے ابن سعود نے حجاز میں ایک مجلس عاملہ قائم کی اور اس کا صدر اپنے لڑکے فیصل کو بنایا۔ اس کے بعد مکہ، مدینہ، جدہ، ینبوع اور طائف میں علیحدہ علیحدہ ذیلی مجلسیں قائم کیں اور ان سب کا تعلق صدر مجلس سے کر دیا اور ہدایت کردی کہ ہر قسم کی اطلاعات فوراً صدر مجلس کو دی جایا کریں اور سب کا رروائیاں صدر مجلس ہی کے مشوروں پر کی جائیں۔

اس زمانہ میں ابن سعود بہت کام کرتا رہا۔ روز آٹھ اٹھارہ گھنٹے مصروف رہتا اور بہت کم آرام لیتا تھا۔ کاروبار میں مزید سہولت پیدا کرنے کی خاطر اس نے ایک موٹر خرید لی اور زیادہ تر موٹر ہی میں سفر کرنے لگا۔ اس کی عمر اس وقت سینتالیس سال کی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اب بھی جوانوں کی طرح چست اور توانا تھا اپنے احکامات کی تعمیل کرانے میں بھی وہ پہلے کی طرح بہت سخت تھا۔ اگر کوئی ذرا شش و پنج کرتا تو بُری طرح اس کی خبر لیتا۔ چنانچہ ایک دفعہ الاخوان کی

ایک جماعت کو ینبوع پر محاصر کرنے کا حکم دیا۔ یہ حج کا زمانہ تھا،  
 الاخوان کچھ بڑ بڑانے لگے۔ ابن سعود نے محافظہ دستہ کے ایک  
 سپاہی کے پاس سے تلوار لے کر اسے نیام سے باہر نکالا اور کہا  
 خدا کی قسم میں ینبوع جانا ہوگا۔ اگر تم میں سے ایک کو بھی یہاں  
 دیکھو ننگا تو اسی طرح اس تلوار سے ختم کرو ننگا جس طرح تمہارے  
 اجداد کی خبر لی گئی ہے، چلے جاؤ“ الاخوان خاموشی سے سر نیچا  
 کر کے چل دیے۔

اب ابن سعود اپنی حکومت کے دائرے کو وسیع کرنا چاہتا  
 تھا، اس کے لیے ضرورت تھی کہ وزراء اور عہدہ داروں کا تقرر  
 کر دیا جائے۔ تنہا ابن سعود اس بوجھ کو کیسے سنبھال سکتا؟ اس  
 مقصد کے لیے اس نے عہدہ داروں اور وزیروں کا انتخاب  
 پہلے عرب سے کیا اس کے بعد مصر، عراق اور ترک کے بھی  
 بعض سنجیدہ اور کار گزار مسلمانوں کی خدمات حاصل کیں۔

ابن سعود کو اپنے بیٹوں پر کافی اعتماد تھا بالخصوص علیہ  
 سعود پر۔ ان دونوں میں ایک قسم کی یکسانیت تھی، دونوں  
 بلند قامت، متمند، مستقل مزاج اور بہادر تھے۔ ابن سعود کی  
 عدم موجودگی میں اس نے ریاض پر نہایت عمدگی سے حکومت  
 کی اور اہل قبائل سے اس طرح کا برتاؤ کیا کہ سب اس سے  
 محبت کرنے لگے۔ فتح حائل کے وقت بھی اس نے بہادری کے

خوب جوہر دکھلائے تھے۔ باپ کی طرح یہ بھی سخت مذہبی تھا۔

— ( ۳ ) —

حجاز اور نجد کے باشندے ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ حجازی نجدیوں کو وحشی کہتے تھے اور نجدی حجازیوں کو بدعتی۔ ایک طرح سے حجازی روشن خیال تھے لیکن نجدی سخت مذہبی۔ ابن سعود نے اسی لیے مکہ میں وزارت خارجہ قائم کی کہ ایک تو وہ جدہ میں رہنے والے بیرونی قوصلوں سے معاملت کر سکے اور دوسرے اس نے مکہ کو ریاض پر اس لیے بھی ترجیح دی کہ نجدی مغربی اثرات اور بیرونی ممالک کے باشندوں کی آمد و رفت سے کہیں، برہم نہ ہو جائیں۔ اسی خاطر ابن سعود نے اہل نجد کو ان معاملات سے دور رکھنا ہی مناسب خیال کیا۔

ابن سعود بذات خود بہت روشن خیال تھا اور دنیا کی ترقی کے ساتھ خود بھی ترقی کرنا چاہتا تھا۔ وہ کسی طرح قدامت پسند نہ تھا چنانچہ وہ کہا کرتا تھا

”میری تمام حکومت قرآن اور حدیث پر مبنی ہے۔ ان میں کسی جگہ بھی ترقی کی ممانعت نہیں کی گئی۔ اور نہ ہی ان میں مشینری، لاسکلی یا اسی قسم کی چیزوں کے استعمال کے امتناعی احکامات ہیں۔“

ابن سعود جانتا تھا کہ اگر عرب کو ترقی کرنا ہے تو پھر جدید

آلات حرب کا استعمال کرنا اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش کام کرنا اس کے لیے ناگزیر ہے ایک موقع پر اس نے دوران تقریر میں کہا ”مسلمان اب خواب سے بیدار ہو رہے ہیں، انہیں دو حربوں کو اپنے قابو میں رکھنا چاہیے، ایک تو خدا کے احکامات اور ان کی پر خلوص تعمیل اور دوسرے طیارے اور موٹر جیسے مادی ہتھیار“

اہل حجاز کو تو اس میں کچھ تامل نہ تھا البتہ اہل نجد اسے قبول نہ کرتے تھے۔ تاہم ابن سعود نہایت احتیاط سے اپنے خیالات سے انہیں روشناس کراتا گیا۔ اس میں امان اللہ کی سی جلد بازی نہ تھی۔ وہ ہر کام کو سوچ سمجھ کر کیا کرتا تھا۔ ہر معاملہ میں وہ علماء سے مشورے کرتا، پہلے ان کو رام کرتا اور پھر انہیں سے ان باتوں کی تحریک کرواتا تھا۔ پھر اہل نجد کو دم مارنے کی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ اس طرح سے ابن سعود نے آہستہ آہستہ یہ مہم سر کی اور ٹیلیگراف، ٹیلیفون، لاسکلی، موٹر طیارے وغیرہ سے اپنے لوگوں کو روشناس کرایا۔

اس کے بعد قرآن حکیم کو پیش نظر رکھ کر، اس نے علماء مشوروں سے ملکی قانون مدون کیا۔ حجاز اور نجد کو متحدہ علیحدہ صوبے قرار دیا۔ سعود کو نجد کا وائسرائے اور فیصل کو حجاز کا وائسرائے بنایا اور خود ان دونوں کا مختار بن گیا۔ لیکن اس



اقتدار و حکومت کے باوجود اس نے اپنی پالیسی نہیں بدلی بلکہ تمام مذہبی معاملات میں علما ہی سے مشورہ کرتا رہا البتہ ملکی اور سیاسی معاملات میں وہ زیادہ تر اپنی رائے پر کام کرتا تھا۔ روسیوں نے ابن سعود کی حکومت اور اس کی سلطنت کے نظم و نسق کو دیکھ کر اسے حجاز کا شہنشاہ تسلیم کیا۔ اسی طرح انگریزوں، فرانسیسوں اور جرمنوں نے بھی اسے نجد و حجاز کا سلطان تسلیم کیا۔ اسی طرح یمن اور ریگستانِ اعظم کے تھوڑے سے جنوبی حصہ کو چھوڑ کر ابن سعود تمام عرب پر — بحیرہ قلزم سے خلیج فارس تک اور ریگستانِ اعظم سے شام کی سرحد تک — قابض ہو گیا۔

# سولہواں باب

## بغاوتیں

— ( ۱ ) —

جب ابن سعود کی شہرت معراجِ کمال پر پہنچ گئی اور ہر طرف سے اسے اطمینان ہو گیا تو پھر سے نئے نئے فتنے برپا ہونے لگے۔ یہ فتنے اسی زمانہ میں جڑ پکڑ چکے تھے جبکہ ابن سعود حجاز میں تھا۔ اس کی واپسی کے بعد معاملات بڑی حد تک سنبھ چکے۔ تاہم دوشیز اپنی ریشہ دوانیوں کے جال برابر پھیلانے جا رہا تھا اور اپنے ساتھ قبائل مطیر اور الاخوان کے چند لوگوں کو لے کر ابن سعود سے اپنی ہتک کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ آل مطیر ابن سعود سے اس لیے نالاں تھے کہ اس نے مدینہ میں انہیں لوٹ مار، قتل و غارت سے منع کیا تھا۔ ہتھلان عثمانی بھی اسی طرح اپنی ہتکتوں

انتقام لینے کے لیے تُلّا ہوا تھا۔ قبائل عتیبہ کا شیخ، بجد، ابن سعود سے اس لیے خفا تھا کہ ابن سعود نے حجازیوں کے ساتھ نرم برتاؤ کیا حالانکہ اس کے خیال کے مطابق تمام حجازیوں کے ساتھ طائف والوں کا سا برتاؤ کیا جانا چاہیے تھا۔ ہتلمان اور بجد نے دوش کا ساتھ دیا کیونکہ دوش کی ماں عجمانی عورت تھی اور اس کی بیوی کا تعلق عتیبہ سے تھا۔ اس طرح یہ تینوں ایک حیثیت سے رشتہ دار تھے۔ دوش کے لیے اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی تھی۔ اس نے ان دونوں کو ارطادیہ بلا کر مشورہ کیا اور ابن سعود کو ڈانٹ کر ایک خط لکھا کہ اس کے تمام افعال غیر مذہبی ہیں، حجاز میں وہابی زندگی پیدا کی جانی چاہیے، ٹیلیفون، لاسکلی، طیارے وغیرہ سب نیست و نابود کر دیے جائیں، تمباکو پر جو ٹیکس لگایا جاتا ہے اور حاجیوں سے جو رقم لی جاتی ہے وہ یک سخت بند کر دی جائے۔ اہل عراق کے خلاف جہاد کا حکم دے دیا جائے کیونکہ فیصل انگریزوں کا آلہ کار ہے اور عراقی بالعموم نجدی قافلوں کو لوٹ کر طرح طرح کی تکالیف دیا کرتے ہیں۔

یہ خط پڑھ کر ابن سعود غصہ کے مارے کانپنے لگا لیکن ایسے موقعوں پر وہ جلد بازی سے کام نہیں لیتا تھا۔ دوش اور اس کے نا عاقبت اندیش ساتھیوں کا یہ لہجہ، ابن سعود

جیسے مقتدر حاکم کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ کوئی دوسرا اس کی جگہ ہوتا تو ذرا بھی شش و پنج کیے بغیر دوش کو اس کی اپنی طفلانہ حرکت کا مزہ چکھانے کے لیے تیار ہو جاتا لیکن ابن سعود نے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے غور کیا کہ اگر ان لوگوں کی کھلی مخالفت کی گئی تو یقیناً وہ عرب کے نصف حصہ کو اس کے خلاف اکسا دیں گے۔ مخالفین کی قوت کو توڑنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ان میں خود آپس میں بھوٹ ڈال دی جائے۔ بجا و سیدھا سادھا مسلمان تھا علماء کے ذریعہ اسے ٹھیک کر لینا کوئی ایسا زیادہ مشکل کام نہ تھا۔ البتہ ہتھکان سے صفائی ناممکن تھی کیونکہ وہ ابن سعود کا سخت دشمن تھا۔ بہر حال ابن سعود نے ہنایت سنجیدگی کا جواب دیا کہ یہ سارا معاملہ علماء کی مجلس میں ان کی رائے کے ساتھ پیش کر دیا جائیگا۔ دوش، ابن سعود کی اس پالیسی کو سمجھ گیا۔ اور فوراً ہتھکان اور بجا کو ہلا کر بھٹکانا شروع کیا کہ ابن سعود نے عراقیوں سے معاہدہ کر لیا ہے، وہ انگریزوں کا دوست ہے اور ان کے ساتھ مل کر بغداد سے مکہ تک ریل کی پٹری ڈالنے کا خیال رکھتا ہے۔ اس طرح سے ریگستان کی آزادی سلب ہو جائیگی، نیز اس صلہ میں ابن سعود نے انگریزوں کو نجد کا نصف حصہ دینے کا بھی وعدہ کیا ہے۔

اس اثنا میں ابن سعود نے دوش کو اطلاع بھیجی کہ وہ

ریاض اگر علماء کے آگے اپنے اعتراضات پیش کرے۔ دوشس بادل ناخواستہ ریاض آیا۔ اس کے ساتھ تین سو بہادر جنگجو ہمرکاب تھے۔

ابن سعود نے شاہی محل کے میدان میں دوشس سے ملاقات کی۔ اس کے بھی سپاہی مسلح اور ہر طرح سے تیار تھے۔ لیکن اس وقت ابن سعود دوشس کے آگے بالکل تنہا کھڑا ہوا تھا۔ اتنے ہی اس نے پُر زور الفاظ میں ابن سعود سے گفتگو شروع کر دی اور ایک ایک کر کے اس کی خامیوں کو گنانے لگا اور عراق کے خلاف جہاد اور محصول خانوں اور ٹیلیگراف اور ٹیلیفون کو برخاست کر دینے کا نہایت شد و مد سے مطالبہ کیا۔ ابن سعود آہستہ آہستہ دوشس کی باتوں کا جواب دے رہا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوشس بھی نرم پڑتا گیا۔ بالآخر ابن سعود نے علماء کو بلوایا، دوشس اور اس کے ساتھیوں نے ان کے آگے اپنے اعتراضات پیش کیے۔ جس پر علماء نے تصفیہ کیا کہ محصول اڑا دیا جائے اور حجاز پر وہابی حکومت قائم ہو۔ ٹیلیفون کے متعلق انہوں نے کہا اس کے ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر نہ ہو تو اور بھی اچھا ہے، اب رہا جہاد کا مسئلہ، تو اس کے متعلق علماء نے کہا کہ یہ مسئلہ ابن سعود سے متعلق ہے کیونکہ وہ امام وقت ہے۔

ابن سعود نے علماء کی ایک بات بھی نہیں کانٹائی بلکہ فوراً ان کے تصفیہ پر عمل شروع کر دیا۔ حجاز میں وہابی حکومت نہ کر دی۔ مدینہ سے باہر جو لاسلکی اسٹیشن بنے تھے، انہیں توڑ دیا اور جہاد کے متعلق اپنی رائے مخالفین میں دوڑا۔ دویش اس سے اب بھی ناراض رہا اور وہاب کا یہ فیصلہ کیا جس پر ابن سعود نے فوراً علماء کو لٹا دیا۔ یہ بات علماء کے تصفیہ کے خلاف تھی۔ عمار دویش کی اس حرکت پر بہتے ہوئے اور قبائل کے ملاؤں کو لکھ بھیجا کہ وہ اہل قبائل کو دویش کے خلاف ابھاریں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اکثر قبائل دویش کے مخالف ہو گئے اور خود قبیلہ مطیہ میں دوگرد ہو گئے ایک ابن سعود کے موافق اور دوسرا دویش کے موافق۔ اس طرح دویش کی قوت پارہ پارہ ہونے لگی اور ابن سعود بھی یہی چاہتا تھا۔

— (۳) —

ابھی ابن سعود، دویش کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھا کہ ایک نیا شگوفہ کھلا۔ کاکس۔ سے ابن سعود کا یہ معاہدہ ہوا تھا کہ نجد اور عراق کے مابین حد قائم کی جائے اور ایک حصہ مالک آزاد رہے تاکہ دونوں سے امن قائم رہے اور اس علاقہ میں کوئی قلعہ وغیرہ تعمیر نہ کیا جائے۔ لیکن ۱۹۲۲ء میں نجد کے انگریزوں کی مرضی کے مطابق اپنے آدمی روانہ کیے کہ وہ

بوسنی کے چشموں کے پاس ایک پولیس اسٹیشن تعمیر کریں۔ یہ چشمے اس آزاد علاقہ میں واقع تھے۔ پہلے ہی سے مطیر عراق کے خلاف جہاد کرنا چاہتے تھے، اب جو انہوں نے عراقیوں کو اپنی آزادی میں حائل دیکھا تو حملہ ہی کر بیٹھے اور کئی مزدور اور سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیے۔ انگریزوں نے بغداد کی طرف داری کی اور ہوائی جہازوں کے ذریعہ قبائل مطیر پر بم برسائے گئے۔

دویش کو تواب موقع ملا۔ وہ فوراً عراق پر دس پانچ حملے کر کے بہت سا مال غنیمت لوٹ لایا۔ ہر دفعہ انگریزوں نے اس کا پیچھا کیا اور اس طرح سے کئی گاؤں تباہ و برباد ہو گئے۔ یہ حال دیکھ کر اکثر قبائل دویش کے ساتھ ہو کر عراقیوں اور انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دویش نے ایک بڑی کافی بے قاعدہ فوج کے ساتھ پڑتے پانی میں عراق پر حملہ کر دیا اور جو بھی راستہ میں ملا اسے قتل کر دیا۔ کئی گاؤں تباہ کر دیے کھجوروں کے بن کے بن کاٹ ڈالے اور قبیلہ جو اسیر کے تین سو آدمی قتل کر ڈالے۔

انگریز ہوائی جہازوں سے اس کا پیچھا کرتے ہوئے نجد کے علاقے میں ارطاد یہ تک پہنچ گئے۔ اس اثناء میں دویش نے کویت کو اطلاع بھیجی کہ بندرگاہ کو اس کے لیے چھوڑ دیا جائے

ورنہ کویت پر بھی حملہ ہو جائیگا لیکن اہل کویت نے اس کی ایک نہ سنی اور دروازے بند کر لیے اور انگریزوں نے ان کے لیے ایک جنگی جہاز روانہ کیا۔ عراق کی سرحد پر تمام قبائل دویش سے خوف زدہ تھے، مطیر بھی بے قابو ہو گئے، عجمان بھی تیار ہو گئے اور بجا دتین ہزار آدمیوں کو لے کر پہنچ گیا۔

— — — — — ۳ — — — — —

اس وقت ابن سعود ریاض میں تھا، جیسے ہی اسے یہ خبر ملی وہ سمجھ گیا کہ اس وقت بہت جلد معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیے ورنہ نجد کے حق میں بُرا ہوگا اور خواہ مخواہ انگریزوں سے جنگ کرنی پڑیگی اور سارا عرب پھر سے جنگ و جدل، لوٹ مار کا بازار بن جائیگا۔

ابن سعود نے بغداد میں انگریزوں کے پاس ایک خط روانہ کیا اور معاملات کی کیسوئی کے لیے فوراً ایک کانفرنس منعقد کرنے کا مطالبہ کیا۔ اور ادھر بڑی مشکل سے بجا د کو حملہ سے روکا۔ دویش بھی موقع کی نزاکت کو سمجھ گیا اور ابن سعود کے کہنے کے مطابق خاموش رہا بلکہ اپنی عقیدتمندی کے اظہار کے لیے اس نے تھوڑا بہت لوٹا ہوا مال بھی واپس کر دیا۔ انگریزوں نے سرکلرٹ کلمے ٹن کو جدہ روانہ کیا۔ کلمے ٹن نے دویش اور اس کے حلوں کی سخت شکایت کی۔ ابن سعود نے



سمجھایا کہ اگر یہ معاملہ اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو وہ سب  
 کچھ بھٹیک کر لینگا۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ عراقیوں اور شمریوں  
 کو معاہدہ کے خلاف بوسنی پر پولیس اسٹیشن بنانے کی کیا ضرورت  
 تھی، دوسرے انگریزوں کو اس کا کیا حق تھا کہ باوجود امن و صلح  
 کے معاملہ ہو لینے کے جواہتوں نے طیاروں کے ذریعہ عرب کے  
 اشرافیوں کو نقصان پہنچایا۔ اس کے بعد ابن سعود نے صاف  
 بتا دیا کہ طیاروں پر سے پرچے پھینک کر دھمکیاں دینے سے  
 کیا حاصل جبکہ اس قبائل پڑھنا نہیں جانتے۔ دوسرے یہ کہ  
 اس وقت تو اکثر قبیلے میرے ہاتھ میں لیکن یہی طرز عمل رہا تو  
 وہ کسی کی نہ سینگے اور مرتے دم تک حملہ کرتے ہوئے عراق کی  
 طرف آگے بڑھتے جائینگے اور ایسا حملہ کریں گے کہ پھر کوئی قوت  
 ان کو روک نہ سکیگی۔

تمام موسم گریا ابن سعود اور گلے ٹن کے درمیان یہی گفتگو  
 ہوتی رہی لیکن سب لا حاصل۔ عراقی پولیس اسٹیشن بنانے  
 کے لیے تلے ہوئے تھے۔ انگریز بھی اس پر زور دے رہے  
 تھے لیکن ابن سعود نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بالآخر حج کا  
 زمانہ آگیا اور ابن سعود حج کے لیے مکہ گیا۔ مکہ جانے سے  
 اس کا دوسرا مقصد یہ بتانا بھی تھا کہ وہ اس معاملہ کو کچھ زیادہ  
 ہم نہیں سمجھتا حالانکہ معاملہ بہت پیچیدہ اور اہم تھا۔ اس کا نقش

سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ دولیش پھر سے قبائل کو ابن سعود کے خلاف بھٹکانے لگا۔ خود اہل قبائل بھی بے چین سے ہو گئے حتیٰ کہ علماء بھی جہاد کے مسئلہ پر غور کرنے لگے۔ اسی اثنا میں عبدالرحمن کا بھی انتقال ہو گیا اور علماء پر جو دباؤ اور اثر تھا وہ بھی جاتا رہا ہے۔ صورت حال بالکل نازک ہو گئی۔

حجاز میں بھی بد امنی پھیلنے لگی۔ آل حرب اپنے حقوق کے لیے لڑ رہے تھے۔ دولیش کے لوگوں نے انہیں اور آگسایا۔ شرق اردن میں عبداللہ ابن سعود سے اپنے باپ کا انتقام لے کر سرزمین حجاز کو اپنے قبضہ میں لانے کے لیے طرح طرح کی سازشیں کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے فیصل بغداد کی مالی امداد سے اس نے قبائل روئیلہ میں بے چینی پیدا کر دی۔

اہل حجاز بھی یہ رنگ دیکھ کر بدل گئے۔ انہیں حسین کا زمانہ یاد آگیا جب کہ لوٹ مار، بے بازی سے حاجیوں کا سرمونڈھ کر عیش منایا جاتا تھا۔ ان لوگوں نے بھی خفیہ سازشیں شروع کر دیں۔ ابن سعود نے ان سازشوں کے قلع قمع کی کوشش شروع کر دی اور سولہ سازشیوں کو شہر بدر کر دیا۔

اسی دوران میں اطالیوں کی ہمت افزائی پر امام یحییٰ نے بھی عسیر کو دھمکی دی اور اس پر قبضہ جما کر ابن سعود کو وہاں سے بے دخل کرنے کی کوشش کی۔

یہ سب کچھ تھا لیکن ابن سعود کو خوف صرف اپنے ہی لوگوں کا تھا یعنی اہل نجد سے۔ اگر وہ بدل جاتے تو پھر یہ کہیں کا نہ رہتا۔ یہ سوچ کر ابن سعود نے تمام نجد میں پروانے روانہ کیے اور ہر جگہ سے نمائندے بلائے تاکہ ریاض میں ایک بڑا جلسہ کر کے کسی نتیجہ پر پہنچ سکے۔

(۴)

ریاض کے بڑے محل کے میدان سب لوگ جمع ہوئے۔ علماء، مبلغین، امراء، شیوخ، سردار، عامل، گاؤں کے سربراہ اور وہ لوگ وغیرہ وغیرہ۔ سب آئے لیکن بجاۃ اللہ اور ددیش نے شرکت نہیں کی اس سے صاف ان کے مافی الضمیر اور کھلی مخالفت کا پتہ چلتا تھا۔ جب سب لوگ میدان میں جمع ہو گئے، ابن سعود محل کی سیڑھیوں پر آکر بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے ایک کثیر مجمع تھا اور ہر شخص اس کے متعلق کچھ نہ کچھ اعتراض رکھتا تھا۔ یہ موقع ابن سعود کے لیے واقعی ذاتی ثابت و وجاہت کی نمائش اور اثر آفرینی کا موقع تھا۔ ابن سعود نے سب کا نہایت متانت اور خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور اپنی تقریر شروع کر دی۔

”خدا سب سے بڑا ہے۔ تم سب جانتے ہو کہ جس وقت میں تمہارے پاس آیا، تم لوگ کس قدر ایک دوسرے سے علیحدہ

تھے اور کس طرح ایک دوسرے کو لوٹ مار کر کے قتل کیا کرتے تھے۔ جن لوگوں کے ہاتھ تمہاری حکومت کی باگ تھی — خواہ وہ عرب ہوں کہ غیر ملکی، تمہارے خلاف سازش کرتے رہے، انہوں نے تمہارے درمیان تفرقہ ڈالے تاکہ تمہارا اتحاد ٹوٹ کر تمہاری قوت پارہ پارہ ہو جائے۔ میں جب تمہارے پاس آیا، کمزور تھا۔ سوائے خدا کے اور کوئی میرا مددگار نہ تھا کیونکہ تم سب جانتے ہو کہ میرے پاس صرف چالیس آدمی تھے۔ تاہم تم سب واقف ہو کہ میں نے تم میں کس قدر اتحاد اور یکجہالت پیدا کر دی۔

”میں نے کسی سے ڈر کر تمہیں یہاں طلب نہیں کیا ہے۔ پہلے بھی مجھے خدا پر بھروسہ تھا اور اب بھی ہے۔ میں دشمن کی فوج سے ذرا بھی نہیں ڈرتا کیونکہ خدا نے مجھے کامیاب بنایا ہے۔ خدا ہی کا خوف تھا جو میں نے تمہیں طلب کیا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں میں سے اکثر کو میرے اور میرے عاملوں سے متعلق اعتراض ہے۔ میں اعتراضات کو سننا چاہتا ہوں تاکہ اگر کچھ غلطیاں ہوئی ہوں تو پھر ان کا تدارک کیا جاسکے۔ اس سے خدا کی نظروں میں بھی میں اچھا رہوں گا۔۔۔۔۔۔ ہاں اس سے قبل اس امر کا تصفیہ کر لو کہ آیا تمہیں میری قیادت پسند ہے کہ نہیں۔ اگر پسند نہ ہو تو پھر دوسرا کون ایسا

ہے جو میری جگہ یہ کام کر سکتا ہے۔ کوئی شخص اپنے قوت بازو سے میری شخصیت کو دھکا نہیں پہنچا سکتا، میں خود خوشی سے اپنے کو تمہارے آگے پیش کر رہا ہوں کیونکہ میری خواہش یہ نہیں ہے کہ میں اس جماعت پر حکومت کروں جو مجھ سے ناراض ہے۔

”دیکھو تمہارے سامنے میرے خاندان کے اراکین ہیں۔ انہیں میں سے ایک کا انتخاب کرو۔ تم جس کو منتخب کرو گے میں ایمانداری کے ساتھ اس کی امداد کروں گا اور میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ جو کوئی بھی میرے خلاف بولے گا اسے میں نہ تو اب سزا دوں گا اور نہ آئندہ کبھی“

تقریر ختم ہونے کے بعد ابن سعود نے مجمع پر ایک متجسّم نظر ڈالی۔ سبھوں نے بہ آواز بلند کہا ”ہم سب راضی ہیں، ہم تمہارے سوا کسی کو اپنا قائد بنانا نہیں چاہتے“ اس پر ابن سعود نے کہا ”ہاں اگر کسی کو میری ذات سے اعتراض ہے..... تو میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ بلا خوف و خطر مجھ پر وہ ظاہر کر دو اگر اعتراض معقول ہے تو میں اسے قبول کروں گا اور اپنے آپ کو قانون کا پابند کروں گا۔“

”پس اے میری عزیز رعایا کہو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہو، مجھے بتلاؤ کہ لوگوں نے تمہارے قائد اور تمہارے

عہدہ داروں کے متعلق کیا نکتہ چینیوں کی ہیں ؟  
 اس کے بعد ان مختلف نمائندوں نے بہت سے اعتراضات  
 کیے ابن سعود برابر ان کا تشفی بخش جواب دیتا گیا ۔ یہ سلسلہ کئی  
 روز تک جاری رہا ۔ متنازع فیہ مسائل پر علماء کے فتوؤں سے  
 مدد لی گئی ۔ غرض ابن سعود نے ان سب کی خاطر خواہ تشفی کی  
 اور سب لوگوں کے دل اس کی طرف سے صاف ہو گئے ۔ پہلے  
 وہ دشمن بن کر آئے تھے اب جوشیہ دوست بن کر واپس آئے ۔

— ( ۵ ) —

جیسے ہی یہ خبر دوش کو ملی ، وہ سمجھ گیا کہ اگر اب ذری بھی  
 سُستی کی گئی اور ابن سعود نے اسے بے دخل کر دیا ۔ اس نے  
 فوراً ہتھلان اور بجاد کو بھڑکا دیا ۔ یہ سب مل کر عراق اور نجد کے  
 گاؤں پر دھاوا بولنے لگے ۔ ابن سعود کے لیے اب یہ مناسب  
 موقع تھا کہ وہ دوش کی علانیہ مخالفت کرے ۔ اس نے  
 اعلان کر دیا کہ دوش اور اس کے ساتھی باغی ہیں ۔ اس کے  
 ساتھ ہی حافظ وہبہ کے ذریعہ اس نے انگریزوں سے معاملہ  
 کر لیا ۔ انگریزوں نے اسے امداد دینے کا وعدہ کیا کیونکہ وہ  
 جانتے تھے کہ اگر عرب اس طرح بھٹک جائیں تو پھر ان پر  
 قابو پانا مشکل ہوگا اور وہ ہمیشہ سرحد پر تنگ کرتے رہیں گے ۔  
 ساتھ ہی اس کے انگریزوں نے اس امر کا بھی انتظام کر دیا کہ

کویت، عراق اور شرق اردن سے بھی باغیوں کو کوئی مدد نہ دی جائے۔  
ابن سعود نے جلوی کے ذریعہ عجمانیوں کی بھی سرکوبی کا انتظام  
کر دیا۔

ابن سعود کے لیے اب آدمیوں کا فراہم کرنا کوئی مشکل کام  
نہ تھا۔ اکثریت اس کی ہم نوا تھی۔ اس نے اطراف کے گاؤں  
سے لوگوں کو طلب کیا اور جب پندرہ ہزار آدمی جمع ہو گئے،  
تو ابن سعود نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ کا  
سردار اپنے بھائی عبداللہ کو اور دوسرے کا اپنے بیٹے سعود کو  
بنایا اور یہ فوج لے کر بریدہ کے سامنے قیام کیا۔

کئی دن کی لڑائی کے بعد دویش کو محصور کر لیا گیا۔ ابن سعود  
نے دویش کے پاس اپنا قاصد روانہ کیا کہ وہ اس کے سامنے  
آکر اپنی باغیانہ حرکت کا جواب دے۔ دویش نے انکار کر دیا  
جس پر ابن سعود نے عبداللہ اور سعود کو حملہ کی اجازت دے  
دی۔ یہ اپنے آدمیوں کے ساتھ، برہنہ تلواریں لیے اس کے  
خیمہ کی طرف گئے دو گھنٹہ تک لڑائی ہوتی رہی۔ دویش کے  
لوگوں نے زوردار مقابلہ کیا لیکن ابن سعود کی فوج کے آگے  
ان کی کچھ پیش نہ گئی۔ بالآخر دویش بُری طرح زخمی ہوا اور  
اس کا بڑا لڑکا مارا گیا۔

دویش کو گرفتار کر کے ابن سعود کے سامنے لایا گیا۔ اس کے

ساتھ اس کی بیوی، بچے اور خاندان والے زار زار رو رہے تھے۔  
 دولش میں اتنی سکت بھی نہ تھی کہ حرکت کر سکتا۔ اس کے بچوں  
 نے ابن سعود سے رُو کر جان بخشی کی استدعا کی کیونکہ کسی کو توقع نہ تھی  
 کہ دولش معاف کیا جائیگا۔ ابن سعود نے پہلے بہت غصہ سے اس  
 کی طرف دیکھا۔ پھر یکدم اس کا غصہ اتر گیا اور اس نے دولش کو  
 معاف کر دیا اور اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے ارطاویہ پہنچا  
 دیا جائے اور ساتھ ہی اپنے خانگی ڈاکٹر مدحت کو اس کے علاج  
 کے لیے روانہ کیا۔

ابن سعود نے ایک خاص مقصد کی تحت دولش کو معاف کیا۔  
 وہ صورتِ حال دیکھ کر سمجھ گیا کہ وہ مر رہا ہے۔ جب وہ خود ہی  
 مر رہا ہے تو اسے مارنے سے کیا فائدہ؟ بلکہ اٹے اسی کا نام  
 ہو گیا کہ ایک بد معاش اور باغی کے ساتھ بھی ابن سعود نے انتہا  
 درجہ رحم سے کام لیا۔

اس کے بعد بجا دگر قرار کیا گیا اور اسے جس دوام کی  
 سزا دی گئی۔ دوسرے باغیوں کی بھی اچھی طرح سرکوبی کی گئی  
 کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی گئی اور جس نے بھی مخالفت کی  
 اسے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ اس طرح اس بغاوت کو فرو  
 کر کے ابن سعود حج بیت اللہ کے لیے مکہ روانہ ہوا۔



لیکن بجاوت کا ابھی پوری طرح خاتمہ نہیں ہوا۔ رکھ سے پھر شعلے اٹھنے لگے۔ دویش جسم کا مضبوط اور دل کا قوی تھا۔ دن بدن وہ اچھا ہوتا گیا اور ابن سعود کی معافی کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے وہ پھر سے مخالفت کے بیج بونے لگا۔ اس کے ساتھی الاخوان ابھی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے اور ابن سعود کو نیست و نابود کرنے کے دریپے تھے۔ ہتھلان اور دوسرے باغی جو ابن سعود کے ہاتھ سے بچ کر ادھر ادھر بھاگ نکلے تھے، ایک ایک کر کے آنے اور قبائل کو اکسانے لگے۔ عجمان اور مطیر کے قبیلے پھر باغیوں کے ساتھ ہو گئے۔

جلوی نے اپنے لڑکے فہاد کو باغیوں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ فہاد نے موقع پا کر ہتھلان کو قتل کر ڈالا لیکن بہت جلد ایک عجمانی نے اسے بھی زندہ نہ چھوڑا۔ جلوی کو اپنے بیٹے کی موت کا سخت رنج ہوا اور وہ یکدم بیمار پڑ گیا جس کے باعث باغیوں کو اس کے باشندوں کو بھٹکانے کا بھی موقع مل گیا۔

ابن سعود کو ان واقعات کی اطلاع مکہ میں ہوئی۔ وہ فوراً دو سو جنگجو بہادروں کے ساتھ موٹروں میں بیٹھ کر ریاض پہنچا اور نہایت عجلت کے ساتھ اپنی فوج فراہم کر لی۔ اب کی

دفعہ موٹروں کی وجہ سے ابن سعود کو دشمن پر اچانک حملے کرنے میں بڑی مدد ملی اور باغی اس سے سخت پریشان ہو گئے۔ وہ ایسی لڑائی کے لیے قطعاً تیار نہ تھے۔ اس پریشانی کے عالم میں عراق کے سرحدیوں نے دویش کے لوگوں پر حملہ کر دیا جس سے ان کی ہمت اور بھی ٹوٹ گئی۔ عجمانیوں نے اپنے گھروں کا راستہ لیا لیکن عتیبہ پر قیام کر کے ابن سعود نے ان مغرور جتھوں کی خوب خبر لی۔ لیکن دویش برابر لڑے جارہا تھا، اسے کسی رحم و کرم کی امید نہ تھی۔ اب کی دفعہ بھی وہ سخت زخمی ہوا اور اس کا دوسرا لڑکا مارا گیا۔

یہ حال دیکھ کر وہ اپنے ساتھی مشہور اور باقی ماندہ فوج کو لے کر عراق کی سرحد کی طرف بھاگ نکلا اور وادی بطن میں قیام کیا۔ اسے اطمینان تھا کہ اتنا جلد اب یہاں کوئی نہ آسکیگا لیکن ابن سعود کے آدمی موٹروں میں بیٹھ کر اس کے تعاقب میں نکلے اور دویش کی جماعت پر حملہ کر دیے۔

مشہور بھاگ کر عراق پہنچا اور وہاں سے شام پہنچ کر اس نے فرانسیسوں کے پاس پناہ مانگی۔ دویش بھی سکوت کی طرف بھاگ نکلا لیکن راستے میں انگریزوں نے اسے گرفتار کر کے ابن سعود کے حوالہ کر دیا جس نے اسے بجاد کے ساتھ ریاض کے قید خانہ میں قید کر دیا۔ اس دفعہ ابن سعود نے ذری بھی رعایت

نہیں کی بلکہ باغیوں کو بُری طرح قتل کیا، ان کے گاؤں جلا دیے اور ان کی زمینات پر قبضہ کر لیا۔ نافرمان بردار الاخوان کو ایک زوردار دھمکی دی جس کے بعد کسی کو سراٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ابن سعود نے کہا

”یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہاری قدر کرتے ہیں، یہ نہ سمجھنا کہ تم نے ہماری خدمت کی ہے اور ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ تمہاری حقیقی قدر و قیمت اسی میں ہے کہ پہلے خدا کی عطا کرو اور بعد ہماری..... اور یہ نہ بھول جانا کہ تم میرے کوئی ایسا نہیں ہے جس کا باپ، بھائی یا کوئی رشتہ دار ہماری تلواروں کا مزہ نہ چکھا ہو۔ ہم نے تمہیں تلوار سے رام کیا ہے، وہی تلوار اب بھی تمہارے سروں پر ہے۔ یاد رکھو، دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہ کرنا۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہاری اور مٹی کی قدر برابر ہوگی۔ ہم نے تم پر تلوار ہی سے کامیابی حاصل کی ہے اور تمہیں تلواروں ہی میں جکڑے رکھینگے“

اس طرح بغاوت کا خاتمہ ہو گیا۔ بہتان مارا گیا، بجا د اور دوش قید گئے۔ ان کے بغیر اہل قبائل کیا کر سکتے؟ پھر سے ابن سعود کا مران ہو گیا۔

# سترہواں باب

## موجودہ طرز حکومت

— ( ۱ ) —

یہ قصہ ختم ہونے کے بعد ابن سعود استحکام سلطنت کی طرف اپنی پوری توجہ سے کام کرنے لگا۔ اس نے محسوس کیا کہ علماء اور وہابیوں کی قدامت پرستی ترقی کے راستے میں روٹے الٹا رہی ہو۔ موٹر، ٹیلیفون، ٹیلیگراف، لاسکی، ہوائی جہازوں اور دیگر مشینوں کی اسے سخت ضرورت تھی۔ اب اس نے تہیہ کر لیا کہ کسی تاخیر کے بغیر یہ سب چیزیں مہیا کی جانی چاہئیں۔

اس مقصد کے لیے اس نے مکہ سے باہر اور ریاض میں طاقور نشر گاہیں قائم کر دیں، ہر جگہ ٹیلیگراف اور ٹیلیفون لگوا دیے۔ لارپوں میں تک لاسکی کے آلات نصب کر دیے گئے تاکہ وقتاً فوقتاً حکومت

عہدہ دار ایک دوسرے سے بات چیت کر سکیں اور فوج کو احکامات دیے جاسکیں۔ خود ابن سعود نے کئی موٹریں خریدیں اور اوروں کو بھی اس کے لیے مجبور کیا۔ ۱۹۲۶ء میں نصف درجن سے زیادہ موٹریں بے تھیں اور ۱۹۳۰ء میں ان کی تعداد دیرھ ہزار سے تجاوز کر گئی۔ ان کے لیے سڑکوں کا بھی انتظام کیا گیا۔

اس کے بعد ابن سعود نے بہت کچھ فوجی تنظیم کی۔ ایک باقاعدہ فوج بنائی اس فوج کو جدید آلات حرب کا استعمال بتلایا گیا۔ جنگی موٹریں اور طیارے خریدے گئے۔ اس دفعہ بھی الاخوان کو بے قاعدہ فوج میں شریک کیا گیا کیونکہ یہ لوگ فوجی خدمات کے بہت اہل اور بہادر تھے۔ اب سلطنت کے تمام کام ٹیلیفون، ٹیلیگراف، لاسکلی اور موٹروں کے ذریعہ انجام پانے لگے۔ اس سے اتنا فائدہ ہوا کہ کسی کو سراٹھانے کی گنجائش نہ رہی۔ جہاں کسی نے سرکشی کی، فوراً اس کی اطلاع مل گئی موٹروں کے ذریعہ فوج روانہ کی گئی اور وہ فتنہ دب گیا۔ چنانچہ آل حرب نے بغاوت کی، فوراً اس بغاوت کو دبا دیا گیا۔ حسن اور سی نے عسیر میں بغاوت کر دی اور اب وہ ابن سعود کی طرف کوچ کرنے والا ہی تھا کہ لاسکلی سے اس کی اطلاع مل گئی اور وہیں مدافعت کا انتظام ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی ابن سعود نے سرحدی الٹ سے دوستانہ

تعلقات پیدا کر لیے انگریزوں نے اسے خود مختار بادشاہ تسلیم کیا اور جدہ میں اپنا ایک نمائندہ روانہ کیا۔ فیصل بغداد نے بھی مصحت کر لی۔ لیکن حسین کا بیٹا عبداللہ اب بھی اسی طرح برہم رہا، وہ اب بھی ابن سعود کو حجاز سے نکال باہر کر کے اپنا قبضہ جانا چاہتا تھا لیکن جب ٹٹونہ چل سکا تو مجبور ہو کر اس نے بھی دوستی کر لی۔ جنوب میں امام یحییٰ نے حسن اور یسی کی طرفداری کر کے ابن سعود پر حملہ کی دھمکی دی۔ ابن سعود نے اپنے لڑکے سعود کی سرکردگی میں باقاعدہ فوج سرحد پر روانہ کر دی۔ مہینوں کی خط و کتابت کے بعد امام یحییٰ نے بھی مصالحت کر لی۔

جنگ وجدل سے فراغت پانے کے بعد ابن سعود نے اپنی رعایا کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ اس کے لیے پیسے کی سخت ضرورت تھی، عرب ایک غریب ملک ہے اور دنیا کی تجارتی کساد بازاری نے اسے اور بھی مفلس و نادار بنا دیا۔ حجاج کی تعداد بھی بہت کچھ گھٹ گئی تھی تاہم ابن سعود نے اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کر دیا۔ سعودیوں کی پُر امن حکومت نے حجاج کے دل بڑھا دیے اور سال بہ سال حاجیوں کی تعداد میں اچھا خاصہ اضافہ ہوتا گیا اور آمدنی بھی کافی بڑھتی گئی۔

ابن سعود نے گاؤں اور شہروں میں بچوں کی تعلیم کے لیے مدارس کھول دیے، مصر اور شام سے اساتذہ بلوائے ان کے نصبا

کا زیادہ حصہ مذہبی تعلیم پر مبنی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ فنی تسلیم کی طرف بھی توجہ دی جاتی ہے، جا بجا دو خانے قائم کیے گئے اور سفری دو خانوں کا انتظام کیا گیا تاکہ ڈاکٹر گائوں اور قصبوں میں دورہ کر کے معمولی علاج اور ابتدائی طبی امداد سے متعلق ہدایات دیں۔ آمدنی بڑھانے کی خاطر اس نے مکہ سے جدہ تک ریل ڈالنے کا گتہ ایک ہندوستانی کمپنی کو دے دیا۔ امریکن اسٹانڈرڈ آئیل کمپنی کو بھی ایک گتہ دیا اور دوسری کمپنیوں کو سونے اور دیگر معدنیات کو دریافت کرنے کا گتہ دیا۔

بدویوں کو کام پر لگانے کے لیے اس نے زراعت شروع کرادی۔ اس کے لیے پانی کی ضرورت تھی۔ ماہران فن کو بلوا کر اس نے چشمے کھدوائے اور پمپ لگوائے جس سے بدوی زراعت کی طرف مائل ہو کر لوٹ مار کے دھندوں سے بے نیاز ہونے لگے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ابن سعود نے اپنے لوگوں کے لیے امن و امان کی فضا پیدا کر دی اور ایک ایسی قوم کو جو سالہا سال سے خواب غفلت میں مدہوش پڑی ہوئی تھی، اچھی طرح سے جگادیا اور ایک ایسے راستے پر ڈال دیا ہے کہ جس پر چلتا ترقی و کامرانی کی ضمانت ہے۔

— ( ۲ ) —

اب ابن سعود نجد اور حجاز کا سلطان ہے۔ اس نے اتنی

بڑی سلطنت اپنی قوتِ بازو سے حاصل کی۔ جہاں کی منتشر جماعتوں کو ایک رشتہ میں منسلک کرنا، ان کو قدامت پسندی کے قہرِ ندیت سے نکال کر تمدنِ قوم بنانا اسی کی قوتِ ارادی اور خلوص کا نتیجہ ہے۔ ایک وہ زمانہ تھا جب کہ عرب کی سرزمین پر لوٹ مار اور غارتگری کا بازار گرم تھا۔ سخت سے سخت جرائم کے لیے کوئی سزا نہ دی جاتی تھی۔ تعلیم و تعلم سرے سے مفقود تھے، گویا عجز و حشیوں کا مسکن تھا۔ لیکن ابن سعود نے یکہ و تنہا اپنے وطن کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ قدم قدم پر وہ ناامیدیوں سے دوچار ہوتا گیا اور بسا اوقات اس نے جائگاہ مصیبتیں جھیلیں لیکن ان سے اس کے عزمِ صمیم اور استقلال میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اپنی دھن میں ناممکن کو ممکن بناتا جا رہا تھا۔ اسے اپنے خدا پر کافی بھروسہ تھا بالآخر اس کا مقصد برآیا، اس نے عرب میں اب ایک ایسی حکومت قائم کر دی ہے جہاں خداوند کریم کے احکامات کی پابندی اس شدت سے ہوتی ہے کہ دوسری کوئی اسلامی سلطنت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چوری کے لیے ہاتھ کاٹ دینا، لوٹ مار پر سخت سزائیں دینا، قتل کے بدلہ قصاص، بے نمازیوں کو سزا — یہ سب اس دینار کے چلتے قانون ہیں جس پر آج ابن سعود کی حکومت ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود ابن سعود کی زندگی سادگی کا



نمونہ ہے۔ شان و شوکت سے وہ کوسوں دور رہتا ہے۔ غلام ہو کہ امیر، ہر ایک کو عام اجازت ہے کہ اس کے آگے آ کر اپنے معاملات پیش کرے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا ہے اور اس کے دربار میں، معاملہ کی حد تک کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں۔

بیرونی ممالک کے لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ نہایت عمدہ ہے، باوجود مالی مشکلات کے اپنی سلطنت کا وقار قائم رکھنے کے لیے وہ لوگوں کو بہت ہی گراں قدر تحفے دیتا ہے، سیاحوں کی دعوتیں کرتا ہے، اور ہر شخص سے خواہ وہ کسی حیثیت کا ہو نہایت عمدگی سے ملتا ہے۔ اکثر ممالک کے روساء جب حج کے لیے مکہ جاتے ہیں تو ابن سعود ان کے لیے ان کی شان کے مطابق انتظامات کرتا ہے، اور حتی المقدور تحفے بھی روانہ کرتا ہے۔ عام طور پر بیرونی ممالک کے حاجی اس کی حکومت سے خوش ہیں کیونکہ بدوی دور کے بعد سعودیوں کی حکومت آئینہ رحمت ثابت ہو رہی ہے۔

اگرچہ اس وقت اندرونی بغاوتیں بہت بڑی حد تک فرد ہو چکی ہیں تاہم ابھی اس کے چند مخالف باقی ہیں لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں، آہستہ آہستہ وہ بھی رام ہو جائیں گے۔ چنانچہ حال ہی میں (۱۹۳۵ء) حج کے موقع پر چندینیوں نے

ابن سعود پر خنجر سے حملہ کر دیا لیکن اس کے لڑکے اور دوسرے  
 ساتھیوں نے ان بدمعاشوں کو فوراً گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔  
 بہر حال ابن سعود خدا کے خوف اور خدا ہی کے بھروسہ پر  
 اپنی حکومت چلا رہا ہے خدا کی کتاب اس کا قانون ہے۔  
 اور یہی حقیقی اسلام ہے۔

— م —

اشارة

ابن سعود نجد کا امیر اور وہابیوں کا امام

04

در گھوڑے سے گر کر زخمی ہو ۲۱،  
 ر کی مُبارک سے یرتیاک ملاقات

97

۱۱۔ کا شکریہ سے معاہدہ ۱۹۱۴ء

94

” اور مقوف کا محاصرہ پر گولی سے

### زخمی ۱۰۳

” نے میدان جنگ میں عقد کیا

1.2

۲۲ کے خانگی حالات اور برتاؤ ۱۱۸

119

۱۴۱۔ نے حسین کو شکست دی ۱۴۱

## == کی سر رسی کا کس سے ملاقات

154

— 1 —

۱. ابن رشد - ۴۵، ۴۸، ۴۹، ۵۱، ۵۵،

66-147670609-06

١٢٩١٢٩٦١٣.٦١٢٩١٢٥

1101

ابن سعود کا بچپن ۹، ۸

پر گھنٹیائی بخار کا حملہ ۱۶  
کی روح انجالی میں وحشیانہ زندگی

-1961A

۲۲ کی پہلی شاوی ۲۲

۲۵ کی پہلی ناکام مہم

۱۰۔ کی ریاض بر حرمائی کیلئے

روانگی ۲۳

کار ریاض بر حتمہ ۳۹-۴۳

کار شدہ نوں سے مقابلہ

اور فتح ۵۳،۵۱

ابن سعود کا شمار یوں پر حملہ اور ابن رشید

کی بیوہ سے عقد ۱۵۱

سلطان نجد ۱۵۲

پر سرخ بادہ کا حملہ ۱۶۰

نے ملاؤں کے آگے ودیش

کا معاملہ پیش کیا ۲۱۰

کی معرکتہ آلار اتقریر ۲۱۸، ۲۱۹

پر یمنیوں کا حملہ ۲۳۱

احمد سلیم کا لڑکا ۱۴۹

احمد سودیری، ۷

اخوانی نوآبادیات ۹۸

الن بی ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۳۵

امان اللہ ۲۰۵

امریکن اسٹانڈرڈ آئیل کمپنی ۲۲۸

انجمن اتحاد و ترقی ۴

ب

بجاء شیخ عقیبہ ۱۹۷۲، ۱۹۸۰، ۲۰۰۸، ۲۰۰۹

۲۱۳، ۲۱۶، ۲۱۹، ۲۲۱

۲۲۳، ۲۲۴

بریدہ شہر پر ایک سو آدمیوں کو سولی

۳۱

بل ہے ون لارڈ ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۲۵،

۱۳۶، ۱۳۷

ت

ترکی، ابن سعود کا لڑکا ۳۳، ۱۳۶

ج

جابر مبارک کا بیٹا ۱۰۷

جلوی، ۳۰، ۳۲، ۳۵، ۳۷، ۳۸

۴۰، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰

جمال پاشا، ترکی گورنر ۱۱۰

جو اسیر چرواہا ۳۸، ۳۹

جوہرہ ۳۶، ۱۳۸

ح

حافظ پاشا ۱۹

حسن ادیبی ۱۹۷، ۲۲۶، ۲۲۷

حسین جرآد ۵۵

حسین شریف مکہ ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱

۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷

۱۰۹/۱۱۱/۱۱۳/۱۲۳-

۱۲۸/۱۲۹-۱۳۰/۱۳۹/۱۴۳

۱۴۴-۱۴۶/۱۴۹/۱۵۱/۱۵۸-

۱۸۲/۱۸۱/۱۶۹/۱۱۶/۱۶۵

۱۸۶/۱۹۹-۲۰۰/۲۲۶

داریه (درعیه) ۵

دولوحی وزیر خارجیه ۱۶۶

دولیش ۱۶۲/۱۶۳/۱۸۱/۱۳۰/۱۳۱

۱۵۰/۱۶۹/۱۹۸/۲۰۶/۲۰۹

۲۱۳/۲۱۶/۲۱۹-۲۲۳

ن

زاهد حسین کاردکا ۱۳۶

س

سارا ۶۱۶

سعد ابن سعود کا بھائی ۶۴/۷۵

۷۶/۱۰۰/۱۰۱/۱۰۶/۱۳۰

۲۲۰

سعدن، شیخ منطک ۲۸/۹۳

سعود ابن سعود کا لڑکا ۱۵۰/۱۵۶

۲۰۳/۲۵

سعود اعظم ۶۹/۲۶

سعود، عبدالرحمن کا بھائی ۱۱/۱۲

سلیم ۱۰۲-۱۰۶/۱۱۳/۱۲۳/۱۲۷

۱۲۹/۱۳۰/۱۳۰/۱۳۷/۱۴۹

سلیم، شیخ قبیلہ شمر ۱۲/۱۳

سنوسی شیخ ۱۸۰

ش

شجرۃ الدر، ملکہ مصر ۱۹۳

شکیپر، انگریزی قوفل ۹۳/۹۵/۹۷

۹۸

ط

طویل، ناظم کروڑ گیری جدہ ۱۶۳/۱۶۸

ع

عبدالرحمن ۸۶/۸۸/۱۱۱/۱۳۰-۲۸۱

۳۰-۳۴/۳۶/۴۵۴/۵۷

۶۳/۸۸/۸۹/۱۰۲/۱۲۶

۱۵۲/۱۶۰/۱۹۹/۲۱۵

عبد اللہ حسین کاردکا ۸۶/۸۷/۹۶